تعلیم و تربیت

ستمبر 1998ء

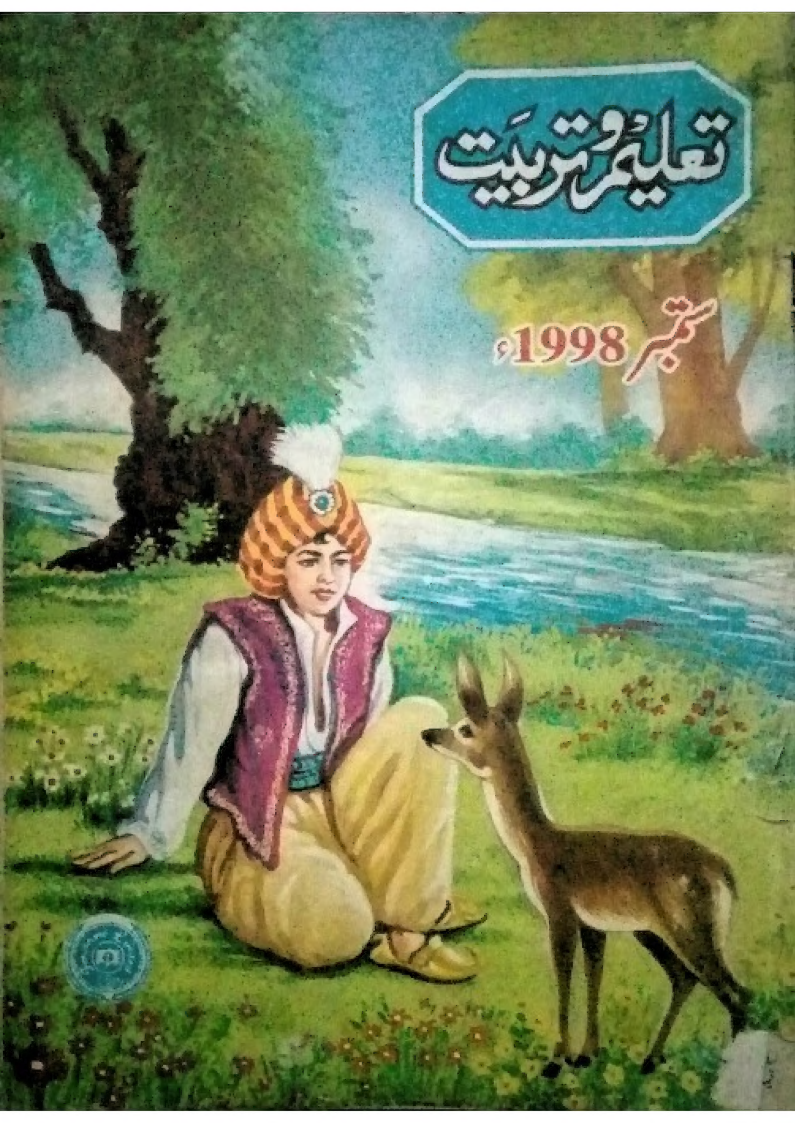

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر | ایڈیٹر/پبلشر | مدیر | مدیر اسسٹنٹ ایڈیٹر | خصوصی مدیر | اسسٹنٹ ایڈیٹر | سرکولیشن اسسٹنٹ

الّو کا محسن

کیا آپ کسی ایسے الّو کے محسن کی کہانی پڑھنا پسند کریں گے جس نے بے شمار اجنبی لوگوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور پھر وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ایسے شریک ہونے لگے جیسے سگے بھائیوں سے بھی بڑھ کر کوئی رشتہ ان کے درمیان موجود ہو؟ یقیناً آپ پڑھنا چاہیں گے۔ تو پھر انتظار کیجیے اگلے ماہ کے شمارے کا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

جب آپ کو تعلیم و تربیت کا یہ شمارہ ملے گا اس وقت آپ تین مہینے کی چھٹیاں گزارنے کے بعد خوشی خوشی اسکول جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے اور بہت ساری باتیں آپ کے ذہن میں ہوں گی جو آپ اپنے ہم جماعتوں سے کرنا چاہتے ہوں گے۔ خواہ آپ کی گفت گو کا موضوع ایٹمی دھماکے، دھوپ چھاؤں ناول اور کہانی چار شہزادے ہو یا آپ اپنے دوستوں کو چھٹیوں میں اپنی سیر و تفریح کا حال بتائیں۔ آپ کے دوست ان موضوعات پر جو بھی تبصرہ کریں وہ ہمیں بھی ضرور لکھیے تاکہ ہم بھی آپ کی اس دل چسپ گفت گو میں شریک ہو سکیں۔

6 ستمبر کو آپ یوم دفاع منائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے 6 ستمبر کی اسی تاریخ کو آج سے 33 سال پہلے بھارت نے ہماری سرحدوں پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ لیکن ہماری بہادر فوجوں اور نڈر عوام نے سترہ دن کی اس جنگ میں دشمن کو بری طرح شکست دی۔

اسی مہینے کی 11 تاریخ کو آج سے 50 سال پہلے ہمارے محبوب قائدِ اعظم محمد علی جناح ہم سے جدا ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں اونچا درجہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کی اچھی اچھی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

ستمبر 1998ء

سرورق: چار شہزادے

قیمت فی پرچہ =/15 روپے

(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

پرنٹر: عبدالسلام

مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

سرکولیشن اور اشاعت: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

اس شمارے میں

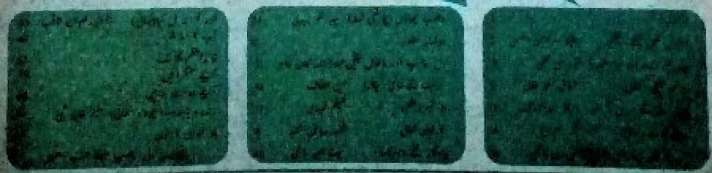

سالانہ قیمت: پاکستان میں صرف رجسٹری کے ساتھ =/345 روپے | مشرق وسطیٰ، افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/600 روپے | یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے | امریکہ، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شاہراہ بن بادیس لاہور (فون) 6278816-6361309-6361310

اسکول کھل گئے

چھٹیاں رخصت ہوئیں اسکول سارے کھل گئے
سستیوں کے آج سارے داغ دھبے دھل گئے
کر دیا تھا سست اور غافل فراغت نے ہمیں
دور رکھا کھیل کی لت نے پڑھائی سے ہمیں
چھٹیوں کا یہ زمانہ کھیل ہی میں کٹ گیا
کم ملی پڑھنے کی فرصت' دھیان ایسا بٹ گیا
"چھٹیوں کا کام" کچھ تو ہو گیا کچھ رہ گیا
جاتے جاتے۔ یہ زمانہ چھٹیوں کا کہ گیا:
ہو گئی اب تک جو غفلت' اب کریں اس کا علاج!
بس پڑھائی! اور باقی چھوڑ دیں سب کام کاج
آئے ہیں اسکول ہم تو رونقیں لوٹ آئی ہیں
ساتھیوں سے مل کے ہم نے کتنی خوشیاں پائی ہیں
تازگی چہروں پہ ہے' اور صاف ستھرے ہیں لباس
خوش ہیں مل کر دوستوں سے' ہم تو تھے بچ مچ اداس
رونقیں تعلیم گاہوں کی یونہی قائم رہیں!
اب پڑھیں گے دل لگا کر' آج سب وعدہ کریں
علم کے میدان میں ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہے یقیں' پورا صلہ محنت کا اک دن پائیں گے

حفیظ الرحمان احسن

دوسرا حصہ

نیاز علی بھٹی

چار شہزادے

دوسری رات جنوبی دروازے والے شہزادے نے اپنی آپ بیتی کا ذکر کچھ یوں کیا۔

"بادشاہ سلامت دروازے سے تھوڑا پرے میدانی علاقہ تھا۔ گو اندھیرا تھا مگر کچھ دیر بعد گھنٹیوں اور جانوروں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ دہقان اپنے مال مویشی لے کر کھیتوں کو جا رہے ہیں۔ میں بھی اندھیرے میں چلتا رہا۔

کوئی دو میل چلا ہوں گا کہ ایک بیل گاڑی ادھر سے گزری۔ جس پر ایک نوجوان دہقان بڑی لے میں کوئی دیہاتی گیت گا رہا تھا اور بیلوں کے گلے میں گھنٹیاں بڑا بھلا میوزک بجا رہی تھیں۔ جوں ہی بیل گاڑی میرے نزدیک آئی۔ میں نے اندھیرے میں رہتے ہوئے دہقان سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھی گاڑی پر بٹھا لے۔

"آؤ بھئی آؤ' اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بیٹھو" دہقان نے فراخ دلی سے کہا۔

"شکریہ۔ مگر..." میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا؟" دہقان نے پوچھا۔

"میں اس وقت آدم زاد ننگا ہوں۔ مجھے کوئی کپڑا دو" میں نے درخواست کی۔ یہ بات سننا تھی کہ اس نے بیلوں پر ڈنڈا مارا اور "بھوت... بھو..." کہتا ہوا بیل گاڑی بھگا کر لے گیا۔ میں نے بہتیرا اسے آوازیں دیں مگر اس نے ایک نہ سنی۔ میں اندھیرے میں چھپا ہوا تھا اور اس فکر میں تھا کہ کیا کروں۔ کیوں کہ ابھی تو اندھیرا تھا' گزارا ہو گیا لیکن دن کی روشنی میں بہت مشکل پیش آنے کا خدشہ تھا۔

ذرا روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کھیت کے ساتھ بہنے والی آبی رو میں چند کپڑے پڑے ہیں۔ سوچا کوئی دہقان نزدیک ہی نہا رہا ہو گا۔ مگر جب کافی دیر بعد وہاں کوئی نہ آیا اور صبح کی روشنی بھی پھیلنے لگی تو میں آہستہ آہستہ ان کپڑوں کی طرف گیا۔ پھر جھٹ سے ان کو پہن لیا۔ میں نے سوچا کہ دیکھا جائے گا۔ اگر کسی نے مانگے تو واپس کر دوں گا۔ مگر مجھے احساس ہوا کہ شاید کپڑے کسی ندی سے بہ کر کھیت کے نالے میں آ گئے تھے' کیوں کہ وہ دھلے ہوئے بھی تھے اور قدرے گیلے بھی!

کپڑے پہن کر قدرے آزادی نصیب ہوئی۔ کیوں کہ اب میں کھلم کھلا اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ پھر میں نے اسی سمت سفر شروع کیا جس طرف بیل گاڑی گئی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر وہ دہقان ملا۔ وہ اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔

"السلام علیکم" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام" اس نے جواب دیا اور ہل چلانے میں مصروف رہا۔

"یہاں سے شہر کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی پندرہ میل... کیا بات ہے؟ خیریت ہے؟" اس نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"مزدوری وغیرہ کی فکر ہے" میں نے اسے بتایا۔

"چودھری کے ہاں مزدوری کر لو۔ مگر ہے وہ ذرا سخت طبیعت" دہقان نے کہا۔

"کوئی بات نہیں مزدوری سخت ہی ہوتی ہے۔ کدھر رہتا ہے چودھری؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹھو ابھی میری بیوی آتی ہی ہو گی۔ لسی وغیرہ پینا پھر اس کے ساتھ چودھری کے ہاں بھجوا دوں گا" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی" میں نے کہا اور وہیں کھیت میں بیٹھ گیا۔

"بھائی جی لسی لیں" دہقان کی بیوی نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونکا۔ میں نے خوب سیر ہو کر لسی پی۔ پھر جب دہقان کی بیوی جانے لگی تو دہقان نے اسے کہا کہ اس جوان کو چودھری کی حویلی کا بتا دینا۔

جب میں چودھری کی حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اندر شور ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی کسی کو مار رہا ہو۔ "خبیث کہتا ہے کپڑے گم ہو گئے ہیں۔ میں تو تیرے باپ سے بھی نکلوا لوں گا۔ بتا کدھر ہیں کپڑے؟" دوسری طرف سے ہائے ہائے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میرے تو پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی! کہ خدانخواستہ جو کپڑے میں نے پہن رکھے ہیں کہیں وہی چودھری کے نہ ہوں! یہ خیال آنا تھا کہ میں چودھری کی حویلی کے دروازے سے بھاگنے کو پر تولنے لگا کہ دو جوانوں نے میری گردن پکڑی اور حویلی کے اندر لے گئے!

"کون ہے؟" بھاری بھرکم چودھری نے گرج کر کہا۔

"چودھری صاحب یہ جوان آپ کی حویلی کے دروازے پر کچھ مشکوک حرکات کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بھاگنے کو تھا کہ ہم نے اسے پکڑ لیا" ان جوانوں نے فخر سے چودھری کو بتایا۔

"اچھا جی! تو کون ہیں آپ؟" چودھری نے طنز اور غصے سے پوچھا۔

"جی جی... ڈر کی وجہ سے میں بات نہ کر سکا۔

"جی جی کا پتر...! اور یہ کپڑے کہاں سے لیے؟ یہ تو میرے ہیں!" چودھری نے کپڑوں کو ہاتھ لگاتے اور مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کپڑے...!" میں بتانے لگا ہی تھا کہ چودھری نے کہا "چور پکڑا گیا" پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا "سچ سچ بتا کتنے میں بیچے ہیں یہ کپڑے تمہارے ہاتھ اس دھوبی نے؟"

"نہیں جی یہ مجھے ملے ہیں۔ اگر آپ کے ہیں تو آپ لے لیں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں جی کا پتر! کہاں سے ملے ہیں یہ کپڑے؟ اور تم میری حویلی کے دروازے پر کیا کر رہے تھے؟ آخر تم ہو کون؟ سچ سچ بتاتے ہو کہ کروں تمہارا بندوبست!" چودھری نے مزید بگڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب میں سچ کہ رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔ ابھی میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ چودھری کے ایک کارندے نے جوتیوں سے میری چھترول شروع کر دی۔ مجھے بہت غصہ آیا اور دل چاہا کہ اپنا تعارف کراؤں۔ مگر آپ کا حکم مانع آیا۔ پتا نہیں کس چمڑے کا وہ جوتا تھا۔ چار پانچ دن تک اس کے نشان نہ مٹے اور درد علیحدہ رہا۔

"رکو رکو! یہ سچ بتائے گا" چودھری نے کارندے کو روکا ورنہ وہ تو شاید میری کھال ہی ادھیڑ دیتا۔

"ہاں جی بتاؤ سچ کیا ہے" چودھری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے تمہاری اور اس دھوبی دونوں کی جان بخشی ہو گی۔ ورنہ یہ چھتری دیکھ رہے ہو" چودھری نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر ساری کہانی بیان کی۔ اس کے بعد چودھری نے دہقان اور اس کی بیوی کو بلایا۔ جنہوں نے میرے بیان کی تصدیق کی اور یوں میری اور دھوبی کی جان بخشی ہوئی۔ خدا کا شکر ادا کر کے جب میں حویلی سے جانے کے لیے مڑا تو چودھری نے پوچھا "اچھا تم مزدوری کرنا چاہتے تھے؟"

"جی کرنا تو چاہتا تھا لیکن اب آپ کے ہاں نہیں کروں گا" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر اس گاؤں میں مزدوری نہیں ملے گی" چودھری نے فخر سے کہا۔

"اللہ سب کا رازق ہے۔ وہ رحیم بھی ہے کریم بھی ہے اور تم جیسا ظالم نہیں" میں نے ذرا حوصلہ مندی سے جواب دیا۔

یہ جواب سن کر چودھری غصے کے بجائے ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا "پڑھے لکھے ہو؟"

"اسی واسطے تو جوتے کھا لیے" میں نے طنزاً جواب دیا۔

یہ سن کر چودھری مزید نرم پڑا اور اس نے پوچھا "کیا کرتے

ہو؟"

"جوتے کھاتا ہوں" میرا غصہ برقرار تھا۔

"تم اچھے اور پڑھے لکھے جوان معلوم ہوتے ہو" چودھری نے کہا۔

"کیا اچھوں کی ایسے خدمت کی جاتی ہے؟" میں نے مزید غصے سے کہا۔

"چلو غصہ تھوک دو" چودھری نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور وہ جوتوں کا حساب کون دے گا؟ جب تک تمہارے اس کارندے سے چھتروں کا حساب نہ لے لوں غصہ کیسے تھوک سکتا ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے" چودھری نے کہا۔

اس کے بعد اس نے اس کارندے کو بلایا۔ میرے سامنے بٹھایا۔ مجھے ایک جوتا دیا اور کہا "لو جی یہ بیٹھا ہے۔ کرلو اپنا حساب برابر"۔

کرمو کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آگ کے شعلے سے نکلنے لگے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا حشر نشر کردوں۔ میں نے غصے میں جوتا اٹھایا اور پورے زور سے مارنے کو ہی تھا کہ مجھے بزرگوں کا قول یاد آگیا "بدلہ لینے سے معاف کرنا بہتر ہے"۔

میں نے جوتا پھینک دیا اور چودھری کے کارندے کرمو کو اٹھا کر گلے سے لگا کر اس سے کہا "جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا!"

یہ منظر شاید گاؤں کے لوگوں اور خود چودھری کے لیے عجیب تھا۔ کرمو کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے اور وہ میرے پاؤں پڑ کر رونے لگا۔ چودھری بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ میرے پاس آیا اور مجھے شاباش دیتے ہوئے کہنے لگا "جوان، تم تو بہت بہادر ہو کہ اپنے غصے پر قابو پا کر دشمن کو معاف کردیا۔ میں بھی تم سے معافی مانگتا ہوں" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں چودھری صاحب، آپ گاؤں کی عزت ہیں ایسے نہ کریں" میں نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ مگر میری حیرانی کی حد نہ رہی جب چودھری نے بھی رونا شروع کردیا۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے پاس بیٹھک میں لے گیا اور کہنے لگا "اب یہ بتاؤ بچوں کو پڑھالو گے؟"

"جی پڑھاؤں گا" میں نے جواب دیا۔

تو تمہاری مزدوری شروع۔ کل سے تم میرے بچوں کو پڑھایا کرو گے۔ حویلی ہی میں تمہاری رہائش اور خوراک کا بندوبست ہوگا اور تنخواہ بھی ملے گی" چودھری نے کہا۔

"گاؤں میں کوئی اسکول ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"تو گاؤں کے بچے پڑھنے کہاں جاتے ہیں؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"اول تو بچے پڑھتے ہی نہیں۔ صرف دو تین ہیں جو یہاں سے چار میل پر ایک پرائمری اسکول ہے وہاں جاتے ہیں" چودھری نے تفصیل بتائی۔

"میں گھر میں آپ کے بچوں کو نہیں پڑھا سکتا" میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"وجہ؟" اس نے پوچھا۔

"میری مرضی" میں نے جواب دیا۔

"پھر بھی ناراض ہو؟" چودھری نے پھر پوچھا۔

"نہیں میں بچوں کو اسکول میں پڑھا سکتا ہوں اور آپ کے بچے بھی اسکول ہی میں پڑھیں گے" میں نے کہا۔

"لیکن یہاں تو کوئی اسکول نہیں" اس نے بتایا۔

"تو اسکول بنوا دیں۔ پڑھاؤں گا میں" میں نے تجویز پیش کی۔

"بات تو ٹھیک ہے مگر خرچ کون برداشت کرے گا؟" اس نے سوال کیا۔

"خرچ بھی آپ کریں گے۔ گاؤں کے چودھری ہیں" میں نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے تو میں اعلان کروا دیتا ہوں کہ میری خالی حویلی میں کل سے اسکول کھلے گا" چودھری نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"کل سے کیوں؟ نیک کام میں دیر کیسی؟ آج ہی گاؤں میں اعلان کروا دیں" میں نے اصرار کیا۔

میری باتیں سن کر چودھری بہت خوش ہوا۔ اس نے کرمو کو

آواز دی اور کہا کہ جاکر گاؤں میں اعلان کر دو کہ گاؤں کے سب بچے حویلی والے اسکول میں پہنچیں اور اگر کسی کے والدین انہیں روکیں تو سارا گاؤں اس خاندان کا سماجی بائیکاٹ کرے گا۔

حضور! دوسرے دن چودھری کی خالی حویلی میں بڑی رونق تھی۔ کوئی بیس کے قریب بچے پہنچے۔ ان میں گاؤں کے چوکیدار کے بھی دو بچے شامل تھے اور یوں گاؤں میں اسکول کا اجرا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ پرسوں اس بہانے سے کہ میں شہر جاکر اسکول کے لیے مزید کتب اور تعلیمی مواد لے کر آتا ہوں۔ وہاں سے چلا آیا اور وقت مقررہ پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

اب مغربی دروازے والے شہزادے کی باری تھی۔ اس نے کہا "خدا بادشاہ سلامت کو زندگی و صحت دے! میں دروازے سے نکل کر اور تھوڑی دور جاکر جس حالت میں تھا اسی حالت میں سجدے میں گر گیا۔ خدا سے دعا مانگی کہ اللہ میاں مجھے صبر و ہمت دے اور میری مدد کر! پھر اللہ کا نام لے کر میں ایک سمت کو چل پڑا۔ میں چلتا رہا حتیٰ کہ میرے راستے میں ایک دریا آگیا جس کے ساتھ ساتھ جنگل تھا اور گھپ اندھیرا تھا۔ تقریباً فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ چلو اندھیرے میں تو ننگے پن کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ اب جب کہ چند گھنٹوں بعد روشنی پھیلنا شروع ہو گی تو کیا کروں گا؟ لہٰذا جوں جوں روشنی پھیل رہی تھی میں پریشان ہو رہا تھا۔ ننگے بدن کو چھپانے کے لیے میں نے دریا کے پانی کا سہارا لینے کا سوچا۔ لہٰذا میں چلتا رہا اور جوں ہی چیزیں صاف نظر آنی شروع ہوئیں میں کنارے کے ساتھ ہی دریا میں تقریباً کمر کمر پانی میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک ہرنی اپنے بچوں سمیت جنگل سے نمودار ہوئی اور دریا کی طرف پانی پینے آئی۔ بہت خوب صورت منظر تھا۔ پس منظر میں سبز جنگل کو چیرتی ہوئی سورج کی سنہری کرنیں، سامنے دریا اور کنارے پر ہرنی اور اس کے بچے! میں ابھی اس منظر میں محو تھا کہ اچانک ہرنی کا ایک بچہ پانی پیتے ہوئے دریا میں گر گیا اور دریا کی تیز لہروں میں غوطے کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر ہرنی بہت پریشان ہوئی۔ وہ کنارے کنارے بھاگتی، کبھی اوپر آسمان کو دیکھتی اور کبھی مجھے۔ میں بھی بڑا پریشان تھا اور ہرنی کی پریشانی کو سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ ایک تو مجھے تیرنا نہیں آتا تھا اور دوسرے ہرنی کا بچہ اب دریا کے بھنور میں جا چکا تھا۔ جب کہ میں صرف اپنے ننگے پن کو چھپائے پانی میں کھڑا تھا۔

حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے زندگی یا موت کا نعرہ لگایا۔ خدا سے مدد کا طلب گار ہوا اور پھر اندھا دھند ہاتھ پاؤں مارتا ہوا ہرنی کے ڈوبتے ہوئے بچے کی طرف جانا شروع کیا۔ خدا نے میری مدد کی اور میں چند منٹوں میں ہی ہرنی کے ڈوبتے ہوئے بچے کو پکڑ کر بھنور سے نکال کر کنارے پر لے آیا۔ مگر اب وہاں سے ہرنی غائب تھی۔ میرے جسم پر کپڑے نہیں تھے کہ دریا سے نکل کر اسے تلاش کرتا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں ہرنی بھی دریا میں نہ گر گئی ہو۔ لہٰذا پانی میں رہتے ہوئے میں نے تیزی سے کنارے کے ساتھ ساتھ اس طرف چلنا شروع کیا جہاں سے بچہ دریا میں گرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہرنی اور اس کے بچے نظر آئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہرنی اور بچے سب پریشان تھے۔ ہرنی مایوسی میں آسمان کی طرف منہ اٹھائے بیٹھی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ ذرا سی حرکت میں آئی اور جب اس نے میرے سر پر اپنا بچہ دیکھا تو خوشی سے پاگل سی ہو گئی۔ وہ اب مسلسل میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو نظر آ رہے تھے۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے خدا کا شکر ادا کر رہی ہو۔

میں نے دریا میں رہتے ہوئے ہرنی کا گیلا بچہ اس کے نزدیک چھوڑ دیا۔ بچہ پانی کے تھپیڑوں سے بہت بری طرح مرجھا چکا تھا اور چل نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر سورج کی کرنوں اور ماں کی گود میں رہنے کے بعد اس میں ذرا حرکت آئی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ یہ منظر دیکھ کر ہرنی خوشی سے چلائی۔

ہرنی اپنے گیلے بچے کو پیار کر رہی تھی اور دوسرے بچے بھی اب کھیل رہے تھے کہ ایک اور آفت آن پڑی۔

پتا نہیں سورج کے طلوع ہوتے ہی ایک شکاری کدھر سے آن نکلا اور تیر کا نشانہ ہرنی پر تان کر اس کے نزدیک آ رہا تھا۔ میں نے بھی اسے دیکھ لیا اور اس کی نیت کا اندازہ بھی کر لیا۔ وہ ہرنی کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے زور زور سے دریا سے پانی کے چھینٹے ہرنی اور اس کے بچوں پر مارنے شروع کیے تاکہ وہ تیر کمان سے نکلنے سے پہلے جنگل میں چھپ جائیں۔ آخر شکاری نے

تیر چلا دیا۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اسی دوران میں ہرنی اور اس کے بچے جنگل میں غائب ہو چکے تھے اور یوں میری محنت رنگ لائی۔

تھوڑی دیر بعد وہ شکاری سرپٹ گھوڑا دوڑاتا میرے نزدیک آیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ کہتا میں نے دریا میں کھڑے کھڑے اسے کہا "میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ اس جنگل میں جانوروں کا شکار کرنا منع ہے۔ اگر تم نے ان کا تعاقب کر کے انہیں کوئی نقصان پہنچایا تو میں بادشاہ سلامت کے پاس تمہاری شکایت کروں گا"۔

میرا یہ کہنا تھا کہ شکاری کے تیور بدل گئے۔ وہ پریشانی میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا بھاگ گیا اور یوں خدا نے ہرنی اور اس کے بچوں کی جان بچائی۔ اب میں دریا کے پانی میں کھڑے کھڑے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "خدایا میری مدد کر"

کچھ دیر بعد اچانک ہی میری نظر پڑی تو میں نے دیکھا کہ جس طرف شکاری بھاگا تھا۔ اس راستے پر ایک گٹھڑی سی پڑی تھی۔ میں جلدی جلدی گٹھڑی کی طرف گیا۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا تو پتا چلا کہ وہ ایک تھیلا تھا۔ جس میں شکار کے اوزار اور ایک رسی کے علاوہ ایک بڑا سا رومال تھا۔ میں نے سارا سامان کنارے پر الٹ دیا۔ تھیلے کا نچلا حصہ کھولا جس سے وہ ایک نیکر سی بن گئی۔ میں نے اسے فوراً پہن کر کمر پر رسی سے باندھ لیا۔ اب میں بہت خوش تھا۔ دریا سے باہر سورج کی تپش محسوس کر کے بہت مزہ آیا۔ ہرنی اور بچے ایک جھنڈ میں بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے باہر دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جھنڈ باہر آ کر میرے ساتھ کھیلنے لگے۔ میں نے ازراہ شفقت ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور وہ سب میرے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اب میں بہت تھک گیا تھا اور چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے سستا لوں۔ لہٰذا میں ایک ہی ایک درخت تلے جا کر لیٹ گیا۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں پھر دریا کے کنارے چل پڑا تاکہ شام سے پہلے پہلے کسی آبادی تک پہنچ جاؤں اور پھر محنت مزدوری کر کے کچھ بھی مٹا سکوں۔ کیوں کہ آپ کی دی ہوئی مدت کا تو ابھی صرف ایک دن ہی گزرا تھا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔

تھوڑی دور اور چلنے کے بعد مجھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے جنگل میں چھپ گیا تاکہ دیکھ سکوں کہ گھوڑوں پر کون لوگ ہیں؟ آواز میرے اور نزدیک ہو گئی۔ میں ڈر بھی رہا تھا کہ خدا جانے کون لوگ ہیں۔ پھر جہاں میں چھپا تھا وہ چاروں گھڑ سوار عین وہاں آ کر رکے اور کچھ گھسر پھسر کرنے لگے۔ لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑا۔

اسی دوران میں گھوڑوں نے ہنہنانا شروع کیا۔ جس سے وہ چاروں پریشان ہوئے اور اور گھوڑوں کو ایڑھ لگائی۔ مگر خدا کی قدرت کہ گھوڑے چلنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ بلکہ اڑیل ہو گئے تھے۔ "شاید تھک گئے ہیں!" ایک سوار نے کہا۔

پھر اس کے بعد انہوں نے دو تین مرتبہ گھوڑوں کو لگام بھی ماری۔ مگر وہ تھے کہ چلنے کو تیار نہ تھے۔ بلکہ ہنہنا رہے تھے۔ وہ چاروں بہت فکر مند ہوئے کہ ضرور کوئی بات ہے۔ مگر ان کی اور نہ میری سمجھ میں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ گھوڑے چل کیوں نہیں رہے۔ اتنی دیر میں مجھے شاید چیونٹی نے کاٹا اور میں نے تھوڑی سی حرکت کی جس سے جھاڑی میں بھی حرکت سی ہوئی۔

"ارے دیکھو اس جھاڑی میں کوئی ہے؟" ایک گھڑ سوار نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کون ہو گا۔ گھنا جنگل ہے؟" دوسرے نے کہا۔

اسی دوران میں ان چاروں نے گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ دیں اور ان سے اتر کر جھاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں میں چھپا تھا۔ اب میں اور دبک کر بیٹھ گیا مگر ہوا یہ کہ جو نہی گھوڑے آزاد ہوئے وہ چاروں جھاڑی کی طرف آگے اور ہنہنانا شروع کر دیا۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اس جھاڑی میں کوئی ہے۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں" ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

پھر وہ چاروں جھاڑی کے پاس آئے اور مجھے وہاں چھپا ہوا دیکھ کر پہلے تو ڈرے اور پھر پوچھا "کون ہو تم؟"

"میں ایک غریب آدمی ہوں۔ دیکھ لو میرے جسم پر تو کپڑے بھی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" دوسرے نے پوچھا۔

"آپ لوگوں کو دیکھ کر چھپ گیا تھا" میں نے جواب دیا۔

چاروں اشخاص گھوڑوں کی حرکت دیکھ کر حیران تھے۔ اب مجھے تھوڑا سا حوصلہ ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟

"ہم ڈاکو ہیں' واردات کی نیت سے نکلے ہیں" ایک ڈاکو نے جواب دیا۔ اور ساتھ ہی کہا "چلو تم بھی ہمارے ساتھ!"

"میں کیا کروں گا" میں نے کہا۔

"ہمارے ساتھ ڈاکے مارنا' حصہ ملے گا" میں نے جواب دیا۔

اسی دوران میں ایک گھڑسوار نے مجھے لپک کر اٹھایا اور اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھالیا۔ میں بھی دبک کر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ جونہی موقع ملا ان سے بھاگ نکلوں گا۔

آدھی رات کے قریب ہم چھپتے چھپاتے ایک آبادی کے قریب پہنچے۔ انہوں نے گھوڑوں کو ایک درخت کے ساتھ باندھا اور مجھے کہا "تم ان کا دھیان رکھو۔ ہم ابھی آتے ہیں"۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک گھر سے شور اٹھا۔ پھر وہ چاروں سروں پر گٹھڑیاں اٹھائے واپس آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک روتی ہوئی بڑھیا بھی آئی۔

"دوڑ جاؤ یہاں سے نہیں تو جان سے مار دوں گا" ایک ڈاکو نے بڑھیا سے کہا۔

"مار دو مجھے! میں نے اب جی کے کیا کرنا ہے" بڑھیا نے جواب دیا۔

"چلو یار چلو روشنی ہونے کو ہے' یہ نہ ہو کہ پکڑے جائیں" دوسرے ڈاکو نے کہا اور ساتھ ہی ایک گٹھڑی میری طرف پھینکتے ہوئے کہا "لو' یہ تمہارا حصہ ہے!"

"تم لوگ تو بہت اچھے ہو!" میں نے گٹھڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" تیسرے ڈاکو نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ تم نے جھوٹ نہیں بولا اور اپنے وعدے کا بھی پاس رکھا۔ لہٰذا تم لوگ برے نہیں ہو سکتے" میں نے جواب دیا۔

"یار! باتوں میں نہ الجھو۔ چلو دن ہونے والا ہے"

وہ سب گھوڑوں پر بیٹھ کر ایک طرف کو چل دیئے۔ لیکن مجھے حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ صبح کی روشنی میں وہ دوبارہ میرے پاس پہنچ گئے۔ بڑھیا بھی میرے پاس درخت تلے سوئی ہوئی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپ اور ہنہناہٹ سے میں بھی جاگ پڑا۔ ڈاکوؤں کو آتے دیکھ کر خوش ہوا اور پریشان بھی۔ دراصل گھوڑے دوبارہ ان کو میرے پاس لے آئے تھے۔

"تم آخر کون ہو؟" ڈاکوؤں نے آتے ہی پریشانی سے پوچھا۔

"میں تو ایک غریب انسان ہوں" میں نے جواب دیا۔

"ان گھوڑوں سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟" ایک ڈاکو نے ناراضگی سے پوچھا۔

"بے زبان ہیں محبت مانگتے ہیں" میں نے کہا۔

"مگر ہم تو ان کی بہت خدمت کرتے ہیں۔ دانہ ڈالتے ہیں۔ پانی پلاتے ہیں اور آرام بھی کرنے دیتے ہیں" دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"مگر ان سے کام تو برا لیتے ہو" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" تیسرے ڈاکو نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ تم ان بے زبانوں کو لوٹ مار اور ڈاکے کے لیے استعمال کرتے ہو" میں نے ذرا جرات سے کہا۔

"یہ تو ہمارا دھندہ ہے" ایک ڈاکو نے جواب دیا۔

"تم لوگ کوئی اچھا دھندہ بھی تو کر سکتے ہو" میں نے کہا۔

"مثلاً کیا؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں کیا چاہیے' عزت یا دولت؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"دولت!" چاروں ڈاکوؤں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"مگر تم سب کو دولت کے ساتھ ساتھ اگر عزت بھی مل جائے تو کیسا رہے؟" میں نے ان سے پوچھا۔

یہ سن کر وہ چاروں سوچ میں پڑ گئے اور حیران بھی ہوئے۔ پھر میں نے ان کو اس بڑھیا کی کہانی سنائی جس کا وہ مال لوٹ کر لائے تھے۔

ہوا یوں کہ رات کو جب ڈاکو چلے گئے تھے تو بڑھیا نے مجھے بتایا کہ وہ بدنصیب اس آدھے گاؤں کی مالکن ہے۔ دو بیٹوں اور خاوند کی وفات کے بعد وہ اس دنیا میں تنہا ہو گئی۔ برے وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ لوگوں نے اس کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ وہ عورت ذات تھی کس کس سے لڑتی۔ آخر تھک ہار کر بیٹھ رہی اور آج رات ان ڈاکوؤں نے اس کی رہی سہی پونجی بھی چھین لی۔

آخر میں میں نے کہا "تم لوگوں نے بہت برے کام کیے ہوں گے۔ کیوں نہ ایک اچھا کام بھی ہو جائے۔ شاید اسی سے خدا تم سب کو معاف کر دے"۔

وہ ذرا نرم پڑے اور یک زبان ہو کر کہا "وہ کیا؟"

"اس بڑھیا کی مدد" میں نے تجویز پیش کی۔

بڑھیا کی کہانی سن کر ان چاروں ڈاکوؤں کے دل بھی پسیج گئے تھے لہٰذا انہوں نے فوراً لوٹا ہوا مال بڑھیا کو واپس کر دیا۔ بڑھیا یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی "میں نے یہ کیا کرنا ہے۔ لے لو میں نے تمہیں بخش دیا۔ میں سمجھوں گی کہ میں نے یہ سب کچھ اپنے بیٹوں کو دیا ہے"۔

بڑھیا کی باتوں کا ان پر بہت خوش کن اثر ہوا۔ وہ گھوڑوں کی لگامیں چھوڑ کر سب بڑھیا کے پاؤں پڑ گئے اور معافی مانگنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے بڑھیا کو اور مجھے علیحدہ علیحدہ گھوڑوں پر سوار کیا اور خود لگامیں پکڑ کر بڑھیا کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ بڑھیا نے خوشی خوشی سب کے لیے کھانا پکایا اور ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد ذرا آرام کے لیے لیٹ گئے۔ گھوڑے بھی تھکے ہوئے تھے۔ ان کو بھی آرام ملا۔ شام کے قریب وہ چاروں اٹھے اور جانے کی اجازت طلب کی۔

"کدھر جاؤ گے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جانا کدھر ہے۔ کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں!" ایک نے جواب دیا۔

"لیکن اگر تم سچے دل سے توبہ کر لو تو میں تم سب کو مستقل ٹھکانہ، عزت اور دولت کا یقین دلا سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"لیکن تم ہو کون؟" ایک ڈاکو نے پوچھا۔

"کہا نا ایک گناہ گار اور غریب آدمی" میں نے جواب دیا۔

"نہیں ہمیں تو تم کوئی مخبر قسم کی چیز معلوم ہوتے ہو۔ تم ہمیں پکڑواؤ گے اور جیل بھجواؤ گے" دوسرے نے ذرا تلخی سے کہا۔

"نہیں یہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ ایک اچھا انسان ہے۔ اس کے وعدے کی میں ضامن بنتی ہوں" بڑھیا نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اب کیا کریں؟" ایک ڈاکو نے پوچھا۔

"میرا کوئی بیٹا نہیں اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی سہارا ہے۔ تم سب میرے بیٹے بن کر میرے پاس رہو۔ میں اپنی ساری زمین تم سب کے نام کر دیتی ہوں۔ اسے کاشت کرو۔ خوب کماؤ اور خوب کھاؤ۔ میرا کیا ہے آج ہوں کل نہیں۔ اس طرح تمہیں ٹھکانہ عزت اور دولت مل جائے گی اور مجھے تمہارا سہارا!" بڑھیا نے کہا۔

بڑھیا کی باتوں کا ان ڈاکوؤں پر اثر ہوا۔ اللہ نے انہیں ہدایت دی۔ وہ اپنے پیشے سے تائب ہو گئے۔ شام تک یہ بات

سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ بڑھیا کے گم شدہ بیٹے مل گئے ہیں۔ ہر بندہ بڑھیا کو مبارک دینے آ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھی مگر اس خبر سے ناجائز قابض بہت پریشان تھے۔

تین چار دن بعد ہم نے گاؤں کی پنچایت بلائی۔ جس میں میں نے تجویز پیش کی کہ گاؤں میں ایک ہسپتال بنایا جائے تاکہ بیماروں کا علاج ہو سکے۔ یہ تجویز سب گاؤں والوں کے لیے بہت خوش کن تھی۔ سب نے اس کو سراہا۔ لیکن مسئلہ تھا ہسپتال کے لیے زمین کا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ اپنی زمینوں میں سے حصہ دینے کو تیار ہیں۔ جب بات پکی ہو گئی تو میں نے اعلان کیا "بڑھیا کی جتنی زمین ناجائز قابضین کے پاس ہے وہ اگر چھوڑ دیں تو بڑھیا اس پر ہسپتال اور دیگر رفاہ عامہ کی عمارات بنانے کو تیار ہے۔

میری یہ بات سن کر چند قابضین آگے بڑھے۔ بڑھیا سے معافی مانگی اور اس کی زمین واپس کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے دن کچھ اور لوگوں نے بھی بڑھیا کی زمینیں خالی کر دیں۔ بڑھیا بہت خوش تھی اور ہم سب کو دعائیں دے رہی تھی۔ پھر میں نے بڑھیا کی سب زمینوں کا حساب لگایا۔ اس کے آٹھ حصے کیے۔ چار حصے تو میں نے تائب ڈاکوؤں کے حوالے کیے۔ ایک حصے پر اسکول، دوسرے پر ہسپتال اور باقی دو حصے ہسپتال اور اسکول کے اخراجات کے لیے ٹھیکے پر دینے کا اعلان کیا۔

"مگر تم نے اپنا حصہ نہیں لیا" بڑھیا اور ان تائب ڈاکوؤں نے کہا۔

"میں تو بڑھیا کے پاس رہوں گا۔ آپ سب کا چھوٹا بھائی ہوں۔ لہٰذا مجھے روٹی کپڑا چاہیے۔ وہ اگر آپ دیں گے تو آپ سب کی مہربانی" میں نے جواب دیا۔

پھر ہم سب نے گھوڑوں کی مدد سے گاؤں میں کھیتی باڑی شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ ہسپتال اور اسکول کی تعمیر کے منصوبے بنائے اور یوں زندگی ایک نئے رخ سے شروع ہوئی۔ جب آپ کی مدت ختم ہونے کے قریب آئی تو میں بڑھیا اور ان چاروں اشخاص سے اجازت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔

چاروں شہزادوں کی روداد سن کر بادشاہ سلامت نے کہا "اس بات کا فیصلہ کہ جان نشینی کا بہترین حق دار کون ہے۔ کل رات کے کھانے کے بعد کیا جائے گا"۔

دوسرے دن رات کے کھانے کے بعد ملک کے قاضی اعلیٰ نے جو خفیہ کمیٹی کے صدر تھے، فیصلہ سناتے ہوئے سب سے پہلے بادشاہ اور ملکہ کو اپنی اور خفیہ کمیٹی کے ممبران کی طرف سے تمام شہزادوں کی بہ سلامت واپسی پر مبارک دی اور کہا "سب شہزادوں نے جس طرح ہمت اور صلاحیت سے غیر معمولی حالات اور مصائب کا مقابلہ کیا ہے وہ سب اس کے لیے مبارک باد کے حق دار ہیں۔ یہ قوم اور ملک کے لیے بھی خوش آیند ہے۔ بہر حال خفیہ کمیٹی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جان نشینی کا بہترین حق دار مغربی دروازے والا شہزادہ ہے۔ جس نے نہ صرف چند گمراہ انسانوں کو صحیح راہ دکھائی بلکہ بے زبان ہرنی کے بچے کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا تک نہ کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بے زبان گھوڑے بھی اس سے خوش تھے"۔

فیصلہ بادشاہ، ملکہ اور سب شہزادوں کے لیے باعث فخر تھا اور سب نے مغربی دروازے والے شہزادے کو مبارک باد اور شاباش دی۔ شہزادے نے سب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے مستقبل کے فرائض کی ادائیگی میں مدد کی درخواست کی۔

بادشاہ نے خفیہ کمیٹی کے صدر اور ممبران کا شکریہ ادا کیا اور حکم دیا کہ اعلان کر دیا جائے کہ شہزادے کی رسم جان نشینی چار دن بعد دربار عام میں ادا کی جائے گی اور ہر شہری کو دعوت عام ہے۔ ساتھ ہی اس نے وزیر خاص کو کہا کہ اس مخصوص مہینے کے دوران میں شہزادے جن جن اشخاص سے ملے تھے ان سب کو دعوت خاص کے دعوت نامے بھیجے جائیں۔ اور پھر یوں بڑے جشن سے شہزادے کی جان نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اس دن بادشاہ اور ملکہ کو حیرت ہوئی جب انھیں بتایا گیا کہ ایک ہرنی اپنے بچوں کے ساتھ شاہی باغ میں گھس آئی ہے۔ جب شہزادے کو یہ خبر ملی تو وہ فوراً خود ہرنی اور بچوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے باغ میں گیا۔ اسے آتا دیکھ کر ہرنی اور بچے قلانچیں بھرتے ہوئے آئے اور اس کے پاؤں میں بیٹھ گئے۔ شہزادے نے بچوں کو گود میں اٹھا لیا اور ہرنی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ ہرنی اور اس کے بچے بھی شاہی مہمان ہیں۔ ان کو کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

دو کلو چینی

اشفاق احمد خان

عمر نے "شیخ جنرل اسٹور" پر نظر ڈالی۔ بلا مبالغہ دس منٹ ہو گئے تھے لیکن گاہکوں کی تعداد تھی کہ کم ہونے میں نہ آتی تھی اور یہ روز کا تماشا تھا۔ عمر کو اکثر ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شیخ صاحب میں سوائے اس بات کے اور کوئی خاص خوبی نہ تھی کہ وہ چیز ٹھیک خالص دیتے اور وقت پر دیتے تھے۔ اسی لیے نہ صرف مارکیٹ کے اردگرد کے لوگ بلکہ دوسرے محلوں کے لوگ بھی شیخ صاحب کی دکان پر آتے تھے۔ علاوہ ازیں شیخ صاحب زبان کے بہت کڑوے تھے۔ اسی لیے ان کے مزاج کو سمجھنے والے ان سے کبھی بحث نہ کرتے تھے۔

آخر بڑی دقت سے رش میں عمر نے بھی ہاتھ بڑھا کر دو کلو چینی کے پیسے شیخ صاحب کو دینے کا موقع مل گیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ بھی اور گاہکوں نے بھی اپنے اپنے آرڈر دے کر پیسے تھما دیے۔ شیخ صاحب نے باری باری سب کو چیزیں تول کر دیں۔ عمر کو پیسے دیے کافی دیر ہو چکی تھی۔ عمر کی باری سب سے آخر میں آئی کہ شیخ صاحب تو تقریباً بھول ہی گئے تھے۔ اس نے تین مرتبہ شیخ صاحب کو آواز دی تب چینی اس کے ہاتھ میں آئی۔ وہ چینی کا لفافہ پکڑے دکان کے تھڑے سے نیچے اترا تو شیخ صاحب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے! میاں صاحب زادے!"

عمر نے مڑ کر دیکھا اور کہا "جی! مجھے بلایا ہے آپ نے؟"

"صاحب زادے! یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ آپ پیسے ادا کیے بغیر ہی جا رہے ہیں" شیخ صاحب نے کہا۔

"پیسے دیے بغیر؟" عمر حیرت زدہ رہ گیا "پیسے تو میں نے پہلے ہی دے دیے تھے"۔

"بری بات برخوردار! بہت بری بات! ایک تو پیسے نہیں دیے اوپر سے جھوٹ بھی بول رہے ہو" شیخ صاحب نے کہا۔

"شیخ صاحب! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے پیسے دے دیے ہیں"۔

"اچھا! تو تمہارا خیال ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں" شیخ صاحب غصے میں آ گئے۔

"جی۔ نہیں شیخ صاحب میں یہ تو نہیں کہہ رہا" عمر گھبرا گیا۔

"تم جو بھی کہہ رہے ہو، پیسے یہاں رکھو اور چینی لے جاؤ" شیخ صاحب نے اس کے ہاتھ سے چینی چھین لی۔

عمر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "شیخ صاحب! آپ نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ یہ تو چھ

روپے تھے' میں تو کبھی بڑی سے بڑی رقم کے لیے بھی جھوٹ نہ بولوں"۔

لیکن شیخ صاحب بے رخی کے عالم میں دوسرے گاہکوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ عمر کو شدید غصہ آیا۔ اب آدمی ایسا بھی بے مروت نہ ہو۔ اس کی جیب میں اپنے ذاتی پیسے بھی تھے۔ اس نے وہ نکال کر گنے اور شیخ صاحب کو تھمانے ہی لگا تھا کہ اسے کچھ خیال آگیا۔ شیخ صاحب نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اب وہ بھی ان کی دکان سے کوئی سودا نہیں لے گا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ دوسری دکان پر چلا گیا۔ وہاں سے چینی خریدی اور گھر واپس آگیا۔

اسٹور پر سہ پہر کے وقت رش تقریباً ختم ہو گیا۔ شیخ صاحب دراز کھول کر روپے گننے لگے۔ اچانک دو گاہکوں نے آکر سلام کیا اور کہا کہ وہ تقریباً آٹھ دس ہزار روپے کا سامان خریدنا چاہتے ہیں۔ شیخ صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے انہیں دکان کے اندر بلا کر بٹھا لیا۔ ان گاہکوں نے سامان کی لمبی چوڑی فہرست ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ شیخ صاحب پھرتی سے سامان نکالنے اور تولنے لگے۔ سامان لانے کے لیے انہیں بعض اوقات اندر تک جانا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان میں سے ایک گاہک نے ایک طرف لٹکے ہوئے دکان کے تالے کو جس میں چابیاں لٹک رہی تھیں' اٹھا کر چھپا لیا۔ شیخ صاحب واپس آئے تو اس آدمی نے کہا "شیخ صاحب' میرا ساتھی یہیں بیٹھا ہے آپ تسلی سے سامان نکالیں' میں ذرا کام سے جا رہا ہوں ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا"۔

شیخ صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اس آدمی کی سنئے جو چابیاں اور تالا لے کر گیا تھا۔ وہ ایک چابیاں بنوانے والے کے پاس گیا اور کمپیوٹرائزڈ مشین پر سب چابیوں کی ایک ایک نقل بنوالی۔ اس کام میں بمشکل بیس منٹ لگے ہوں گے۔ جب وہ واپس دکان پر پہنچا تو شیخ صاحب ابھی تک مصروف تھے۔ اس آدمی

نے دوبارہ ...

بھی اسی طر...

سب سامان

رقم ...

ن

ایک طرح

جیب پیسے د...

شیخ صا...

کوئی بات نہیں

روپے ایڈوانس ... ہیں۔ ...

لے کر رکھ لیے اور انہیں بتا دیا کہ وہ رات کو آٹھ بجے دکان بند کرتے ہیں۔ اگر وہ آٹھ بجے تک آگئے تو سامان مل جائے گا ورنہ بات پرسوں پر جا پڑے گی۔ کیوں کہ اگلا دن اتوار کا تھا اور اتوار کو تو ہر مارکیٹ بند ہوتی ہے۔

وہ آدمی چلے گئے۔ شیخ صاحب نے ان کے سامان کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اوپر کپڑا دے دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے گاہک کو کوئی نقصان پہنچے۔ وہ کاروبار کے معاملے میں مکمل ایمان داری کے قائل تھے۔ سامان جمع کرتے کرتے وہ اپنے کاؤنٹر سے بھی چیزیں اٹھا کر متعلقہ خانوں میں رکھنے لگے۔ اچانک ان کے ہاتھ میں چینی کا ایک لفافہ آگیا۔ فوری طور پر تو ان کے ذہن میں نہ آسکا کہ یہ چینی کا لفافہ یہاں کیوں پڑا ہے۔ پھر اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال سا کوندا۔ انہیں عمر یاد آگیا۔ وہ بڑبڑائے "وہ... وہ چینی لے کر نہیں گیا" انہیں افسوس سا ہوا۔ لیکن ان کے خیال میں اس نے پیسے ادا نہیں کیے تھے۔ اسے چاہیے تھا کہ پیسے ادا کر کے چینی لے جاتا۔ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی سخت رویہ اپنا لیا تھا۔ لیکن اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ جانتے تھے کہ اس لڑکے کے والد کی چار پانچ دکانیں چھوڑ کر کپڑے کی دکان ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ عمر دوبارہ نظر آئے گا تو وہ چینی اسے دے دیں گے۔ شاید اس نے پیسے دے ہی دیے

دوں۔

شیخ صاحب رات آٹھ بجے تک ان دونوں گاہکوں کا انتظار کرتے رہے جو سامان شام کو لے جانے کا وعدہ کر کے گئے تھے۔ لیکن وہ گاہک جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ پھر شیخ صاحب نے اپنے وقت پر دکان بند کی اور گھر چل دیے۔ اگلا دن اتوار کا تھا۔ یقیناً گاہکوں کو سامان پیر کے دن ہی ملنا تھا۔

یہ اتوار صبح دس بجے کا وقت تھا۔ پوری مارکیٹ بند تھی۔ اچانک ایک ٹرک مارکیٹ میں داخل ہوا اور شیخ جنرل اسٹور کے عین سامنے رک گیا۔ ٹرک میں سے وہی دونوں گاہک اترے جو شیخ صاحب سے سامان بندھوا کر رکھ گئے تھے۔ حقیقت میں وہ چور تھے۔ انھوں نے چوں کہ دکان کی چابیوں کی نقل تیار کروا لی تھی اس لیے انھیں دکان کھولنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ دکان میں سے سامان اٹھا اٹھا کر ٹرک میں رکھنے لگے۔ دکان چوں کہ بہت بڑی تھی اور اس میں مال بھی بہت زیادہ تھا۔ اس لیے کم از کم یہ کام دو تین گھنٹوں میں مکمل ہونا تھا۔ وہ دونوں بڑی تن دہی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھے۔

اب اتفاق دیکھیے۔ عمر کو اس کے والد صاحب نے بھیجا کہ جاؤ دکان کھول کر وہاں سے جتنے پیسے ہیں سب نکال لاؤ' زیادہ رقم تو وہ خود لے آئے تھے مگر جو چند سو روپے وہاں تھے وہ بھی منگوانا چاہتے تھے۔ شاید انھیں کوئی فوری ضرورت آن پڑی تھی۔ عمر اپنی سائیکل پر مارکیٹ پہنچا۔ ٹرک کے پاس سے گزر کر اپنی دکان پر گیا اور اس کا تالا کھولنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیاں نکالیں۔ جیسے ہی اس نے تالے میں چابی ڈالی' اس کا ذہن الجھن کا شکار ہو گیا۔ "آج تو چھٹی ہے۔ پھر شیخ صاحب کی دکان کیوں کھلی ہے؟ وہاں ٹرک کیوں کھڑا ہے؟" اس نے تالے میں سے چابی نکالی اور ٹہلتا ہوا شیخ صاحب کی دکان کی طرف چل پڑا۔ ٹرک کے قریب رک کر اس نے دکان کے اندر نظر ڈالی۔ شیخ صاحب تو اسے نظر نہیں آئے البتہ دو اجنبی افراد اس نے ضرور دیکھے جو سامان اٹھا کر ٹرک میں رکھ رہے تھے۔ پہلے تو وہ وہاں سے چل دیا۔ اس نے سوچا اسے کیا ضرورت ہے پرائے معاملے میں زیادہ تجسس کرنے کی۔ لیکن پھر واپس آگیا اور ان میں سے ایک آدمی کو جو دکان کے اندر جا رہا تھا روک کر پوچھا "شیخ صاحب کہاں ہیں اور آپ کون ہیں؟"

"شیخ صاحب' آج گھر پر ہی ہیں۔ ہم ان کے کزن

ہیں" وہ آدمی بولا۔

"میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا' میں ان کے تقریباً ہر رشتے دار کو جانتا ہوں" عمر نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم پہلے کبھی نہیں آئے تھے' پہلی مرتبہ آنا ہوا ہے اور پھر یہ دیکھو یہ چابیاں' شیخ صاحب نے ہی ہمیں دی ہیں۔ ہم رشتے دار نہ ہوتے تو وہ ہمیں چابیاں کیوں دیتے؟" وہ آدمی عمر کی تنقید کا برا منائے بغیر بولا۔

"لیکن آپ یہ سامان کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"شیخ صاحب نے یہ دکان بیچ دی ہے اب ہم یہ سامان یہاں سے شفٹ کر رہے ہیں"۔

عمر اس کے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوا لیکن اس نے مزید سوال و جواب کرنے کے بجائے وہاں سے چلنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن اب اس کا رخ اپنی دکان کی طرف نہیں بلکہ مارکیٹ کے صدر کے گھر کی طرف تھا جو بالکل قریب تھا۔ صدر مارکیٹ نجیب اللہ صاحب نے عمر سے ساری بات سنی تو وہ بھی حیران ہوئے اور فوراً اس کے ساتھ چل دیے۔

وہ لوگ ابھی تک سامان لادنے میں مصروف تھے۔ صدر یونین نے ان کو جا پکڑا اور ان سے تفصیلی پوچھ گچھ کی لیکن وہ تسلی بخش جواب نہ دے پائے۔ اتنی دیر میں مارکیٹ کا چوکی دار بھی آگیا۔ نجیب اللہ نے کہا "خان صاحب' یہ دیکھو کیا ہو رہا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ' پکڑو ان کو!"

"پکڑو" کا لفظ سنتے ہی وہ دونوں بھاگ نکلے۔ چوکی دار نے دوڑ کر ایک کو تو قابو میں کر لیا البتہ دوسرا بھاگ نکلنے میں کام یاب ہو گیا۔ نجیب اللہ صاحب نے فون کر کے شیخ صاحب کو بلا لیا۔ سارا معاملہ سن کر شیخ صاحب کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ بھاگے بھاگے آئے۔ دکان کا حلیہ دیکھ کر حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ کبھی ٹرک کو دیکھتے اور کبھی دکان کو۔ اس آدمی کو جسے چوکی دار نے پکڑ رکھا تھا وہ فوراً پہچان گئے۔ یہ وہی کل والے گاہکوں میں سے ایک تھا۔ لیکن ان کے پاس چابی کہاں سے آئی؟ یہ بات وہ نہ سمجھ سکے۔ نجیب اللہ صاحب نے پولیس کو بھی فون کر دیا تھا۔ پولیس آئی تو معاملہ چند منٹ میں ہی حل ہو گیا۔ انہوں نے اس آدمی سے سارا قصہ اگلوا لیا۔ تب شیخ صاحب پر چابیوں کی حقیقت کھلی۔ شیخ صاحب نے عمر کو شکریہ بھرے انداز میں دیکھا "بیٹے' آج تو تم نے مجھے بچا لیا"۔

"میں نے نہیں شیخ صاحب' اللہ نے بچا لیا۔ وہ مجھے یہاں بھیجنے کا سبب پیدا نہ فرماتا تو میں کیسے آتا؟"

"تم نے ٹھیک کہا بیٹے' لیکن میں حیران ہوں کہ تم نے میرے لیے اتنا اچھا سوچا' میرا اتنا فائدہ کیا۔ میں نے تو کل غصے میں تمہیں بہت کچھ کہا تھا۔ کیا تم نے اس کا برا نہیں منایا تھا؟"

"برا تو منایا تھا شیخ صاحب' اسی لیے آپ کی دکان کے بجائے دوسری دکان سے چینی لے گیا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے افسوس سا ہوا تھا۔ آپ بزرگ ہیں بڑے ہیں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم چھوٹے ہیں ہمیں بزرگوں کا احترام کرنا چاہیے۔ میرے دل سے تو کل ہی غصہ ختم ہو گیا تھا۔ آپ کے دل میں ہو تو میں کہہ نہیں سکتا" عمر نے ہنس کر کہا۔

"جیتے رہو بیٹے' سعادت مند اور نیک والدین کی اولاد ہو۔ خدا تمہیں خوشیاں دے اور ہمیشہ کام یاب کرے"۔

پولیس اس مجرم کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی کا پتا بھی بتا دیا تھا۔ عمر وہاں سے چلنے لگا تو شیخ صاحب نے اسے آواز دی۔ عمر نے مڑ کر دیکھا۔ شیخ صاحب کے ہاتھ میں چینی کا وہی لفافہ تھا۔ "بھئی اپنی امانت تو لے جاؤ۔ میں نے کل ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ تمہیں ہر صورت میں دوں گا۔ چاہے پیسے دیئے ہوں یا نہ دیئے ہوں اور اب تو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تم نے پیسے ادا کر دیئے ہوں گے"

عمر نے مسکرا کر چینی کا لفافہ پکڑا اور اپنی دکان کی طرف چل پڑا۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

درس قرآن

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں

بچوں کے لیے درس قرآن میں ہمارا آج کا موضوع ہے "اخوت اسلامی" یعنی مسلمانوں کا باہمی بھائی چارہ' اس اہم عنوان پر بات چیت کے لیے ہم نے 26 ویں پارہ کی 49 ویں سورہ (الحجرات) کی آیت نمبر 10 کے ان پہلے تین لفظوں کا چناؤ کیا ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ"

ترجمہ: "بے شک تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"

لوگوں کے بارے میں مسلمانوں کا نظریہ یہ ہے کہ ساری دنیا کی انسانی مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اس کنبے کے تمام رکن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے انھیں محبت و شفقت اور رحم و درگذر سے کام لینا چاہیے۔ اللہ کے کنبے کے کسی شخص سے ظلم و زیادتی اور حق تلفی و ناانصافی کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

اخوت اور بھائی چارے سے متعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ؐ کی ہدایتیں بالکل واضح ہیں۔ مگر کس قدر افسوس ہے کہ مسلمان ان سب باتوں کو بھول چکے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ دنیا میں پیار و محبت اور صلح و آشتی پھیلانے والے خود تشدد اور نفرت کی دلدلوں میں بری طرح پھنس چکے ہیں۔

اخوت اسلامی کے احکام کی نافرمانی کی چند بدترین مثالیں یہ ہیں: فرقہ وارانہ فسادات' علاقائی تعصب' نسلی نفرتیں' ذات پات کی اونچ نیچ کے چکر' دہشت گردی' چوری چکاری' ڈاکہ زنی' فراڈ' ناانصافی اور حق تلفی وغیرہ کے مختلف مظاہرے۔ یہ تمام اور اسی طرح کی دیگر حرکتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایسے گندے کام کرنے والے اخوت و محبت کے اسلامی احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اخوت و محبت ویسے بھی ایک اہم فطری تڑپ ہے جسے کسی طرح مجروح کرنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔

محترم نونہالو! دیکھا آپ نے اخوت اسلامی کس قدر اہم اور مفید جذبہ ہے!! اس جذبے کو آپ اپنے اندر خوب ترقی دیں بلکہ اپنے اردگرد کے حلقوں میں بھی اس کا پرچار کرتے رہیں۔ اپنے گھر' مدرسہ' مسجد اور محلہ میں جو چھوٹے بڑے لوگ نفرت اور تشدد کی باتیں کرتے دکھائی دیں آپ انھیں بڑے آرام سے سمجھائیں کہ ایک دوسرے سے نفرت اور تشدد بہت بری حرکتیں ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت اور رواداری میں جو لطف آتا ہے وہ نفرت اور تشدد کی آگ میں کبھی آہی نہیں سکتا۔

سُرخ گلاب

نجمہ معراج

معوذ اور معاذ دو بھائی تھے۔ ان کے والد اسکول ٹیچر اور والدہ گھریلو خاتون تھیں۔ معوذ اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب کہ معاذ کی عمر ابھی چار سال میں سے ایک ماہ کم تھی۔ معوذ کو اسکول جانے کے لیے تقریباً آدھ کلو میٹر کا سفر پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔

معوذ بہت ذہین بچہ تھا۔ وہ اب تک تیسری جماعت کے سوا ہر جماعت میں اول آیا تھا۔ وہ اسکول جاتے وقت بہت سی چیزوں کے آگے سے گزرتا۔ سب سے پہلے کچے برتنوں کی دکان آتی پھر ایک پنکچر لگانے والے کی دکان تھی۔ اس سے تھوڑا آگے کھانے پینے کی چیزوں کی دکان تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر پودوں کی ایک نرسری تھی۔ جہاں بہت سے پودوں کی پنیری اور گملوں میں لگے ہوئے مختلف پھول دار پودے تھے۔

معوذ کے دل میں قدرت نے پودوں سے بہت محبت ڈالی ہوئی تھی۔ ابھی وہ بہت چھوٹا تھا جب موسم بہار میں اپنے صحن میں نکلا تھا۔ فرش پر اینٹوں کے درمیان جو چھوٹے چھوٹے پودے خود بخود اگ آتے ہیں۔ وہ انھیں بہت دلچسپی سے دیکھتا۔ پھر حیرت سے اپنی امی کو پکارتا "امی جی! دیکھو ہمارے صحن میں کتنے خوب صورت پودے اگے ہوئے ہیں۔

ماں اکثر دیکھتی اور کہتی "بیٹا ادھر کوئی گندم کا دانہ گر گیا ہوگا۔ یہ گندم کا پودا ہے"۔

پھر وہ کوئی چھوٹی سی چیز پکڑتا مثلاً گلاس پیالی یا کسی ٹوٹے ہوئے کچے برتن کا ٹکڑا اور اس ننھے پودے کو اس سے ڈھانپ دیتا۔

معوذ اسکول جاتے ہوئے باقی دکانوں پر تو سرسری نظر دوڑا کر گزر جاتا تھا مگر نرسری پر پہنچ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم خود بخود رک جاتے تھے۔ وہ نرسری میں پڑے ہوئے گملوں کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ وہ گھر سے اسکول کے لئے جلدی نکل جاتا اور اسکول کا وقت ہونے تک ان پودوں کے پاس کھڑا رہتا۔ وہ روزانہ لوگوں کو پودے خریدتے اور مختلف پھولوں کی پنیری خریدتے دیکھتا۔

ایک دن ایک آدمی نے گلاب کے پودے والا گملا خریدا۔ معوذ گلاب کا پودا دیکھ کر اس جستجو میں نرسری کے مالک کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا کہ وہ معلوم کر سکے کہ نرسری کا مالک پودے کی قیمت کیا مانگتا ہے۔ جب اس نے پودا خریدنے والے کو 30 روپے دیتے دیکھا تو معوذ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ کسی نہ کسی دن وہ بھی یہ پودا خرید سکے گا۔ اسکول تک وہ اپنے آپ سے یہ عہد کرتا گیا کہ آئندہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ نہیں خرچ کرے گا اور جب تیس روپے جمع ہو جائیں گے تو وہ گلاب کا پودا خرید کر گھر لے جائے گا۔ وہ بلاناغہ ابو سے جیب خرچ تو لیتا ہی تھا۔ معوذ اسکول سے گھر واپس آتا تو بھوک پیاس سے

کھلایا ہو گا۔ ماں پوچھتی "بیٹا معوذ! آپ روزانہ اسکول جاتے وقت اپنے ابو سے پیسے بھی لے کے جاتے ہو پھر آخر اسکول میں کچھ کھاتے کیوں نہیں ہو؟"

معوذ یہ کہہ کر ٹال دیتا "امی دل ہی نہیں چاہتا"۔

وہ روزانہ کا جیب خرچ الماری میں رکھی ہوئی اپنے ابو کی کتابوں میں سے ایک بڑی سی کتاب کے اندر رکھ دیتا۔ ایک دن معوذ نے اسکول جانے سے پہلے پیسے گنے۔ یہ کل پچیس روپے تھے۔ اس نے جلدی سے جیب میں ڈال لیے۔ آج اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ اب نہ تو اسے جیب خرچ ملنا تھا اور نہ ہی اس نے نرسری کے پاس سے گزرنا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج اسے ہر صورت میں گلاب کا پودا خریدنا ہوگا۔ ادھر معوذ کی امی اسے آوازیں دے رہی تھیں "بیٹا معوذ" اسکول جانے کا وقت ہو رہا ہے اور آپ نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا"۔

لیکن معوذ کو ناشتے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس سوچ میں گم تھا کہ گلاب کا پودا خریدنے کے لئے جو پانچ روپے کم ہیں وہ کہاں سے حاصل کیے جائیں۔ ابھی وہ اس سوچ میں گم ہی تھا کہ ابو نے آواز دی "معوذ بیٹا" اپنا جیب خرچ لے لو"۔

وہ ابو کے ہاتھ میں دو روپے دیکھ کر خوش ہو گیا اور لے کر جیب میں ڈال لیے۔ اب اسے یہ بات پریشان کیے ہوئے تھی کہ وہ تین روپے کہاں سے حاصل کرے۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اپنا خوب صورت گیند اپنے دوست نبیل کے ہاتھ بیچ دے کیونکہ نبیل اس سے بہت روز پہلے گیند خریدنے کا کہہ چکا تھا۔ اب اس نے چپکے سے اپنے بستے میں گیند ڈالا اور اسکول کی طرف چل دیا۔ آج وہ راستے میں نرسری کے پاس کھڑا نہ ہوا۔ اسے جستجو تھی کہ وہ پہلے 30 روپے پورے کرے پھر گلاب کا پودا خرید کر گھر لے جائے۔

اسکول میں پہنچتے ہی سب سے پہلے وہ نبیل سے ملا اور اس سے گیند بیچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے فوراً 5 روپے معوذ کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور گیند پکڑ کر چل دیا۔ معوذ اب بہت خوش تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اسے اسکول سے جلدی چھٹی ہو اور گلاب کا پودا خرید کر گھر لے جائے۔ سب بچے ایک دوسرے سے تقریباً تین ماہ کے لئے بچھڑ رہے تھے۔ وہ اپنے دوستوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھرپور انداز سے مل رہے تھے۔ کوئی کسی سے کھیلنے کا وعدہ لے رہا تھا اور کوئی چھٹیوں میں دوبارہ ملنے کا۔ لیکن معوذ گھنٹی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا کہ کب چپراسی ہتھوڑا درخت پر لٹکے ہوئے توے پر مارے اور وہ ٹن ٹن کی آواز پیدا ہونے سے پہلے ہی نرسری کی طرف دوڑ لگا دے اور سرخ گلاب کا خوب صورت پودا خرید کر گھر لے جائے۔

جونہی معوذ کے کان سے گھنٹی کی آواز ٹکرائی اس نے دوڑ لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نرسری کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس نے ایک گلاب کے پودے پر ہاتھ رکھا اور نرسری کے مالک کو مخاطب کر کے پوچھا "چچا جان اس پودے کی قیمت کیا ہے؟"

اس نے کہا "بیٹا 30 روپے"۔

معوذ نے جلدی سے جیب میں سے 30 روپے نکال کر اسے دیئے اور گلاب گملا اٹھا کر گھر کی طرف چل دیا۔ معوذ گلاب کا پودا خریدنے کے بعد بہت خوش تھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی قیمتی چیز حاصل کر لی ہو۔ کیونکہ اس کے دل میں گلاب کا پودا خریدنے کی حسرت بہت پہلے سے تھی۔ لیکن اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ معوذ نے گلاب کا پودا حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس پر بہت قابو رکھا تھا۔ اسکول میں تفریح کے وقت جب وہ بچوں کو مختلف چیزیں کھاتے دیکھتا تو اس کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ بھی کچھ خرید کر کھائے۔ اسے بھوک بھی تو بہت لگی ہوتی تھی۔ لیکن وہ گلاب کا پودا خریدنے کے لئے بھوک برداشت کر لیتا تھا۔

اب اس پودے کی قدر و قیمت تو بس معوذ ہی جانتا تھا۔ جس نے اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد یہ حاصل کیا تھا۔

معوذ نے گھر داخل ہوتے ہی ماں کو آوازیں دینا شروع کر دیں "دیکھو امی میں کیا لے کر آیا ہوں"۔

ماں نے بیٹے کے ہاتھ سے گملا پکڑتے ہوئے پوچھا "بیٹے یہ کہاں سے لائے ہو چلو واپس رکھ کر آؤ؟"۔

معوذ بولا "میں کوئی اٹھا کر تھوڑی لایا ہوں۔ یہ تو میں خرید کر لایا ہوں"۔

"آپ نے اتنے پیسے کہاں سے لیے تھے؟"۔

"امی جان اپنے جیب خرچ میں سے جمع کیے تھے"۔

معوذ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک گلاب کا پودا خرید کر پورے باغ کا مالی بن گیا ہو۔ اس نے گلاب کے پودے کو گھر کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ اب وہ روزانہ اسے پانی دیتا اور دن میں کئی مرتبہ دیکھتا کہ کب اس پر گلاب کے سرخ پھول لگیں گے اور ان کی خوشبو سارے صحن میں پھیلے گی۔ کافی چھٹیاں گزر گئیں لیکن گلاب پر کوئی پھول نہ آیا۔ ایک صبح وہ کیا دیکھتا ہے کہ سبز پتوں میں کوئی سرخ سی چیز ہے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا گملے کے پاس چلا آیا۔ پودے پر پھول نکلا دیکھ کر معوذ بہت خوش ہوا۔ وہ اپنی امی کو بلا کر لایا اور بتایا کہ گلاب کے پودے پر ایک سرخ پھول کھلا ہے۔ یہ بات سن کر اس کا چھوٹا بھائی معاذ بھی پھول پھول کہتا ہوا ماں کے پیچھے ننگے پاؤں دوڑ پڑا۔ معاذ تو پھول دیکھ کر معوذ سے بھی زیادہ خوش ہو رہا تھا اور بے اختیار اپنا ہاتھ پھول توڑنے کے لیے آگے بڑھا رہا تھا لیکن ابھی اس کا ہاتھ پھول سے کچھ دور ہی ہوتا کہ معوذ اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کر دیتا اور ساتھ کہتا "معاذ پیچھے ہٹو! یہ پھول میں نے بہت محنت سے حاصل کیا ہے' کہیں اس کو توڑ نہ دینا۔ ابھی تو میں نے اپنے دوستوں کو دکھانا ہے"۔

یہ 6 ستمبر کی صبح تھی اور معوذ کو آج اسکول جانا تھا۔ کیونکہ اس کے اسکول میں ہر سال 6 ستمبر کے موقع پر تقریری مقابلہ ہوتا تھا۔ جس کا عنوان ہوتا "پاکستان" وہ پھول کو اکیلا چھوڑ کر اسکول نہیں جانا چاہتا تھا مگر امی جان کو اس کی حفاظت کی خوب تاکید کر کے وہ بادل نخواستہ اسکول چلا گیا۔ حسب معمول سب بچوں نے اپنی اپنی تقریریں کیں۔ آخر میں مہمان خصوصی نے انعامات تقسیم کئے اور سب بچوں کو مخاطب کر کے کہا "تقریر تو اپنی اپنی جگہ ہر بچے کی ہی اچھی تھی۔ یہ عنوان ہی ایسا ہے۔ لیکن بچو! میں آپ کو بتاؤں یہ پاکستان ہم نے بہت ہی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ کئی لوگ بھوک پیاس سے مر گئے۔ ماؤں کے کئی جوان بیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو گئے۔ اسی لیے ہم سب کو اس وطن کی اتنی قدر ہے۔ اب کوئی اس ملک پر حملہ آور ہونے کا سوچے تو ہر پاکستانی اپنے سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جنگوں میں لڑنے والے پاکستانی فوجیوں کے دل میں یہی جذبہ تو موجزن ہوتا ہے کہ پاکستان کے لئے ہم اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ کیونکہ یہ ہم نے بہت محنت اور بہت ہی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ دراصل بچو جس چیز کے حاصل کرنے میں جتنی زیادہ محنت اور قربانی دینا پڑے وہ چیز اتنی ہی عزیز ہوتی ہے"۔ مہمان خصوصی کے اس فقرے کے ساتھ ہی پاکستان زندہ باد کے نعروں سے ہال گونج اٹھا اور سب بچے نعرے لگاتے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

معوذ گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے گملے کی طرف گیا کہ گلاب کا کھلا ہوا پھول دیکھے۔ لیکن پھول پودے پر نہ تھا۔ معوذ کے ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ پھول یقیناً معاذ نے توڑا ہوگا۔ وہ یہ بات سوچتے ہی معاذ کو آوازیں دیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو معاذ چارپائی پر بیٹھا گلاب کی سرخ پتیوں کو مسل مسل کر سونگھ رہا تھا۔ معوذ نے یہ دیکھ کر معاذ کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا۔ معاذ چیختا ہوا امی کی طرف بھاگا۔ امی نے معوذ سے پوچھا کہ آپ نے معاذ کو کیوں مارا ہے۔ وہ اپنی امی کو پھول کی پتیاں دکھاتے ہوئے رونے لگا۔ "معاذ نے تو میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے' امی اس نے میری غیر موجودگی میں میرا پھول توڑ لیا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس نے پھول توڑ لینا ہے۔ میں

مشکل ہی نہ جاتا۔ اب میں اس سے مزید بدلہ لوں گا"۔

معوذ اس کو مزید مارنے کی کوشش کرنے لگا لیکن امی اسے بچا کر دونوں کو ان کے والد کے پاس لے گئیں۔ پھر ان کے باپ کو سارا قصہ بتایا۔ باپ نے پہلے معوذ اور معاذ دونوں کو پیار کیا اور پھر معوذ کو سمجھانے لگے "گلاب کا پھول تو آپ نے واقعی بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ لیکن معاذ تو بچہ تھا اس کو یہ علم نہ تھا کہ یہ پھول آپ نے کس قدر محنت سے حاصل کیا تھا۔ اگر معاذ کو اس پھول کی قدر و قیمت معلوم ہوتی تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔ اب غصہ تھوکو، یہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے اسے معاف کر دو"۔

باپ کی یہ بات سنتے ہی کہ آپ نے یہ پھول واقعی بڑی محنت سے حاصل کیا ہے۔ اسے فوراً مہمان خصوصی کی تقریر کا وہ فقرہ یاد آ گیا کہ جو چیز جتنی محنت اور قربانیوں کے بعد حاصل کی ہو اس کی اتنی ہی حفاظت کی جاتی ہے اور اتنی ہی عزیز ہوتی ہے۔ پھر معوذ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ جیسے ہمارے بڑوں نے ہمارے دل میں پاکستان کی قدر و قیمت ڈالی ہے۔ اسی طرح مجھے بھی بھائی کے دل میں پھول کی اہمیت اور قدر و قیمت دلانی چاہیے تھی۔ اس گلاب کے پودے اور پھول کی قدر تو صرف میرے ہی دل میں تھی نا۔ کیوں کہ میں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دی تھیں۔ ہمارے مہمان خصوصی ٹھیک ہی تو کہتے تھے کہ جتنی قربانی دے کر اور جتنی محنت سے کسی نے کوئی چیز حاصل کی ہو، اتنی ہی اس کو اس کی قدر ہوتی ہے اور اتنی ہی شدت سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ہم تو اپنی مختلف تقریروں اور تاریخ کی کتابوں میں اپنے بزرگوں کی پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے دی ہوئی قربانیوں کا تذکرہ سن اور پڑھ چکے ہیں۔ اسی لیے تو ہم پاکستان کی اس قدر حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن بھائی کو کیا پتا تھا کہ میں نے کتنی محنت اور کوشش اور بھوک پیاس برداشت کرنے کے بعد یہ گلاب کا پھول حاصل کیا تھا۔ وہ بھائی کو تھپڑ مارنے پر پچھتا رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی گردن جھکا کر کہنے لگا "بھائی آپ کو میں نے خواہ مخواہ ہی تھپڑ مار دیا۔ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ میں نے اسے کتنی محنت اور قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس طرح جو پاکستانی اپنے وطن کو نقصان پہنچاتے ہیں انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ ہمارے بڑوں نے کتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے"۔

والد نے معوذ کو پیار کیا اور کہا "معاذ بھی بڑا ہو کر سمجھ جائے گا۔ پھر وہ ایسا نہ کرے گا۔ اور ہم سب کو بھی چاہیے کہ جو پاکستان کی قدر نہیں کرتا اسے اپنے بزرگوں کی قربانیاں کی یاد دلائیں جو انہوں نے اس وطن کو حاصل کرنے کے لئے دی تھیں۔ ہمارا ملک بھی تو گلاب کے پھول کی طرح ہی ہے۔ اس کی پتیاں بھی تو اسلام کی خوشبو سے معطر اور شہیدوں کے لہو سے سرخ ہیں۔

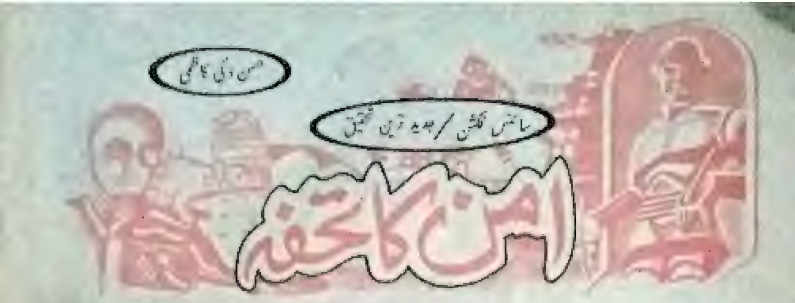

حسن رضی کاظمی

سائنس فکشن / جدید ترین تحقیق

امن کا تحفہ

کئی دن سے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر پہلی خبر ثمرین کے زلزلے کے بارے میں ہوتی تھی۔ ثمرین میں زلزلے پہلے بھی آتے رہتے تھے لیکن ان سے زیادہ نقصان نہیں ہوتا تھا۔ اس بار جو زلزلہ آیا یہ انتہائی خوفناک تھا۔ رات کے وقت زور کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور سوتے ہوئے لوگ جاگ پڑے۔ ابھی وہ سمجھے بھی نہ پائے تھے کہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آرہی ہے کہ زمین زور زور سے ہلنے لگی۔ لوگ ڈر کے مارے گھروں سے باہر نکلنے لگے لیکن جو لوگ جاگے نہیں تھے وہ گھروں ہی میں رہ گئے۔ ان کے علاوہ بہت سے بوڑھے، بچے اور بیمار بھی گھروں سے باہر نہ نکل سکے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ زلزلے سے بڑے بڑے پتھر زمین پر لڑھکنے لگے۔ ایک پتھر دوسرے سے ٹکراتا دوسرا تیسرے سے۔ اس طرح بے شمار پتھروں میں حرکت پیدا ہو گئی اور وہ لڑھک لڑھک کر پہاڑ کے دامن میں بنے ہوئے گھروں پر گرنے لگے۔ زلزلے نے تو گھروں کو ہلا کر رکھ ہی دیا تھا۔ ان پتھروں نے اور بھی تباہی مچادی۔ گھروں کی چھتیں اور دیواریں گرنا شروع ہو گئیں اور ہزاروں لوگ ملبے میں دب گئے۔

بڑا خوفناک ماحول تھا۔ زلزلے کی وجہ سے بجلی بند ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ چیخ پکار اور رونے کی آوازیں تھیں۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے تباہی کا اندازہ لگانا شروع کیا۔ امدادی کام کرنے والی جماعتیں جلد ہی ثمرین پہنچ گئیں۔ ملبے سے لاشوں اور زخمیوں کو نکالا جارہا تھا۔ ایمبولنس گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ زخمیوں کو ہسپتالوں میں پہنچایا جارہا تھا۔ رات کا اندھیرا تو ختم ہو چکا تھا لیکن روشنی نے ماحول کو اور بھی بھیانک بنا دیا تھا۔ ہر طرف لاشیں، زخمی عمارتوں کا ملبہ اور لوگوں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں۔

ثمرین کا علاقہ قدرتی حسن کی دولت سے مالامال تھا۔ لوگوں کے پاس پیسہ بھی تھا۔ لیکن ذہنی سکون نہیں تھا۔ وہ بڑی بے چینی کی حالت میں رہتے تھے۔ اس بے چینی اور بے اطمینانی کی وجہ ان کی آپس کی دشمنی تھی۔ ثمرین کی آبادی صدیوں سے دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ یا یوں سمجھ لیں کہ یہاں کئی صدیوں سے دو قبیلے آباد تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ ان دونوں قبیلوں کی آپس میں دوستی تھی لیکن پھر زمین کے ایک معمولی جھگڑے نے رفتہ رفتہ دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔ دنیا ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں جا پہنچی لیکن اکیسویں صدی میں بھی ثمرین کے باشندوں کی دشمنی وہیں کی وہیں رہی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ثمرین کے باشندوں نے ترقی ہی نہیں کی۔ انہوں نے ترقی تو بہت کی لیکن اپنی قبائلی دشمنی کو نہیں بھولے۔ اگر آپس کی یہ دشمنی نہ ہوتی تو یقیناً وہ اس سے کہیں زیادہ ترقی کر چکے ہوتے۔

دراصل ہوتا یہ تھا کہ ایک قبیلے والے ترقی کے لئے کوئی نیا منصوبہ شروع کرنے کی تجویز پیش کرتے تو دوسرے قبیلے والے یہ سوچے بغیر کہ اس سے سب ہی کو فائدہ پہنچے گا اس کی مخالفت کرنے لگتے تھے۔ اس سے کام میں رکاوٹ پڑتی تھی اور حکومت کو بھی پریشانی کا سامنا ہوتا تھا۔ اکثر بڑے اچھے اچھے کام اس لیے نہیں ہو پاتے تھے کہ مقامی کونسل میں شامل دونوں قبیلوں کے لوگ خواہ مخواہ ایک دوسرے کی مخالفت کرتے رہتے تھے۔

زلزلے کے موقعہ پر بھی دونوں اپنی دشمنی نہ بھولے۔ یہ موقعہ ایسا تھا کہ انھیں صرف انسانیت کی بھلائی کی بات سوچنا چاہئے تھی۔ لیکن وہ اس وقت بھی قبیلے کی بات کرتے رہے۔ دونوں کی کوشش یہ تھی کہ امدادی کام ان کے علاقہ میں پہلے ہو اور زیادہ ہو۔ پہلے ان کے مریضوں کو ہسپتال لے جایا جائے۔ پہلے ان کے گھروں کا ملبہ صاف کیا جائے اور دبے ہوئے لوگوں کو نکالا جائے۔ دونوں ہی قبیلے انتظامیہ کے لئے مشکلیں پیدا کر رہے تھے۔ حالانکہ انتظامیہ کی کوشش یہ تھی کہ جہاں زیادہ ضرورت ہے وہاں پہلے اور زیادہ کام کیا جائے۔ یعنی جن کو مدد کی زیادہ ضرورت ہے اس کی زیادہ مدد کی جائے۔

بہرحال امدادی کام جاری رہا اور انتظامیہ پوری ذمہ داری سے کام کرتی رہی۔ فوری طور پر ایک بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ زخمیوں کے لئے بہت زیادہ خون کی ضرورت تھی۔ بلڈ بنک میں خون تو موجود تھا لیکن اتنا نہیں کہ سب کے لئے مہیا کیا جا سکے۔ اس کے باوجود کوئی مشکل پیش نہ آئی اور ہسپتال والوں نے اعلان کیا کہ خون کی فراہمی کا مسئلہ آسانی سے حل کر لیا گیا ہے اور جس قدر خون کی ضرورت تھی ہو مل گیا ہے۔

تین مہینے گذر گئے۔ زخمیوں کے علاج اور ملبہ صاف کرنے کے کام سے فرصت ہوئی تو عمارتوں، گھروں اور سڑکوں کو پھر سے بنانے کا کام شروع کیا گیا۔ اس کام میں بھی دونوں قبیلوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ دونوں یہ چاہتے تھے کہ انتظامیہ ان کی طرف زیادہ توجہ دے۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ اس نے ایک خطرناک لڑائی کی صورت اختیار کر لی۔ دونوں قبیلوں کے پاس نئے سے نیا اسلحہ موجود تھا۔ جسے بے دریغ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا گیا۔ مجبوراً فوج کو مداخلت کرنا پڑی۔ لیکن فوج کے آتے آتے دونوں طرف کے سینکڑوں لوگ مارے گئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ انتظامیہ کے لئے پھر سے زخمیوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور مزید خون کی ضرورت پڑ گئی۔ بہرحال ایک بار پھر اس مسئلے کو آسانی سے حل کر لیا گیا۔ لیکن اصل مشکل اس وقت پیدا ہوئی جب دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے سے لڑائی کے نقصان کا تاوان مانگا۔

شہر کی انتظامی کونسل نے اس جھگڑے کو نپٹانے کے لئے ایک ہنگامی اجلاس بلایا جس میں دونوں قبیلوں کا ایک ایک نمایندہ بھی شرکت کے لئے آیا۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں کونسل کا یہ اجلاس جھگڑا نپٹانے کے بجائے کسی نئے جھگڑے کا سبب نہ بن جائے۔ کونسل ہال کے باہر سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے۔ اجلاس میں میئر کے علاوہ پولیس، فوج اور بعض دوسرے سرکاری اداروں کے نمایندے بھی شرکت کے لئے آئے تھے۔

اجلاس شروع ہوا تو میئر نے پہلے رخان قبیلہ کے نمایندہ تمار احمر کو دعوت دی کہ وہ اپنا دعویٰ پیش کریں۔ تمار زلزلہ میں شدید زخمی ہوا تھا اور اسے کافی خون دیا گیا تھا۔ وہ ابھی چند ہفتے پہلے ہسپتال سے آیا تھا۔ لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ تمار نہایت جوشیلا اور تیز مزاج انسان ہے لہٰذا ہر ایک کو ڈر تھا کہ وہ جھگڑے کا فیصلہ نہیں ہونے دے گا۔ تمار نے تقریر شروع کی تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اس نے کہا۔ "مجھے بڑی شرم آ رہی ہے کہ میں اکیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر بات کرنے یا اپنے وطن کی خوش حالی کی تدبیر کرنے کے بجائے آپ سے ایک ایسے جھگڑے کی بات کر رہا ہوں جو میرے خیال میں بالکل فضول اور بے مقصد ہے"۔

تمار نے اتنی ہی بات کی تھی کہ اجلاس میں شریک لوگوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ تمار نے کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنی بات جاری رکھی "میں ہرگز کسی تقریر کے لئے یہاں نہیں آیا۔ میں حاتم قبیلہ کے نمایندہ اور اپنے دوست فضیل حاتمی سے کہوں گا کہ وہ اپنے قبیلے والوں کو سمجھائیں اور میں اپنے قبیلے والوں کو سمجھاؤں گا کہ وہ بے کار کے جھگڑوں کو ختم کریں۔ اپنے دلوں کو صاف کریں اور پرانے قصوں کو بھول کر اپنے وطن کی ترقی کے لئے کوشش کریں"۔

سب لوگ حیرت سے خاموش بیٹھے تمار کا منہ تک رہے تھے اور پھر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب فضیل حاتمی نے تقریر شروع کی۔ وہ کہنے لگا۔ "میں اپنے دوست تمار احمر کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے قبیلوں میں یہ دشمنی نہ ہوتی تو ہم آج جس جگہ کھڑے ہیں اس سے بہت آگے ہوتے۔ یقیناً وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم پیچھے کے بجائے آگے کی طرف دیکھیں اور دشمنی ختم کر کے ایک ساتھ وطن کی بھلائی کے لئے قدم

جا جائیں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے کیونکہ دونوں قبیلوں کے لوگ شاید ہماری بات مشکل ہی سے سمجھ سکیں۔ بہر حال کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ زلزلے کے بعد جب میں ہسپتال میں تھا میرے خیالات اسی وقت بدل گئے تھے اور میں موقع کی تلاش میں تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمار کی باتوں سے مجھے یہ موقع ہاتھ لگ گیا۔ میرا خیال ہے کہ تمار کے ذہن میں یہ تبدیلی بھی ان ہی دنوں آئی ہے جب وہ زلزلے کے بعد ہسپتال میں داخل تھے"۔

تمار نے زبان سے کچھ کہے بغیر "ہاں" میں اپنا سر ہلا دیا۔ اجلاس تو خیریت سے ختم ہوا لیکن پورے ثمرین میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ دونوں قبیلوں کے لوگ اپنے اپنے نمائندے سے ناراض تھے۔ لیکن ایک تو اس لئے مجبور رہ رہے تھے کہ انہوں نے خود ان دونوں کو نمائندہ بنا کر بھیجا تھا اور فیصلہ کا حق دیا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ دونوں طرف اب کافی لوگ ایسے نکل آئے تھے جو تمار اور فضیل کی بات ماننے کو تیار تھے اور جھگڑا ختم کرنا چاہتے تھے۔ عجب کی بات یہ تھی کہ تمار اور فضیل کی حمایت کرنے والے سارے لوگ ایسے تھے جو زلزلے میں زخمی ہو کر ہسپتالوں میں داخل ہونے تھے۔ یہ بات لوگوں کے لئے حیرانی کا سبب بن گئی۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ دونوں قبیلوں کے لوگوں کی سوچ میں جو یہ تبدیلی آئی ہے اس کا ہسپتال سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

جتنا وقت گزر رہا تھا تمار اور فضیل کی حمایت بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب رقان اور رحاتم قبیلوں کے درمیان صلح نامہ پر انتظامی کونسل کی نگرانی میں دستخط ہونا تھے۔ اس دن ثمرین میں جشن کا انتظام تھا۔ ہر طرف رونق تھی۔ ملک کے باہر سے بھی بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے کیونکہ یہ بہار کا موسم تھا اور اس موسم میں دور دور سے سیاح یہاں آتے ہیں۔ کونسل ہال کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا لیکن حفاظتی انتظام بہت سخت تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ جو لوگ اب بھی صلح کے مخالف تھے کہیں وہ کوئی گڑبڑ نہ کریں۔

لوگوں کو اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ صلح نامہ کی تقریب کی صدارت جاپان کے ڈاکٹر کاکی فوکووا کر رہے تھے جو مشہور سائنس دان تھے اور ثمرین کی مرکزی تجربہ گاہ میں کام کرتے تھے۔ ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ ثمرین کے دو قبیلوں کے درمیان صلح نامہ کا جاپان کے ایک سائنس دان سے کیا تعلق ہے۔

تقریب خیریت سے ختم ہوئی تو اخباری نمایندوں نے ڈاکٹر فوکوواکو گھیر لیا۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ "آپ کا اس معاہدے سے کیا تعلق ہے؟" ڈاکٹر فوکووا نے دیکھا کہ اب اخباری نمایندوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے تو وہ بولے "اخبار ریڈیو اور ٹی وی کے نمایندے کانفرنس روم میں اکٹھے ہو جائیں۔ میں ابھی چند منٹ میں وہاں پہنچتا ہوں"۔

ڈاکٹر فوکووا کانفرنس روم میں پہنچے تو مکمل خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ ان کی بات سننے کو بے چین تھے۔ انھوں نے بولنا شروع کیا۔ "اخبار، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے محترم نمایندو! یہ بات آپ سب کو معلوم ہے کہ بیسویں صدی ختم ہونے سے چند سال پہلے مختلف کیمیائی اجزا کو ملا کر مصنوعی خون تیار کر لیا گیا تھا۔ میرے ملک میں ڈاکٹر ہوندا نامی ایک سرجن نے اس زمانہ میں سینکڑوں مریضوں کو ہنگامی آپریشنوں کے دوران میں مصنوعی خون دیا۔ یہ مصنوعی خون دراصل ایسا سیال مادہ ہے جو پورے جسم کو آکسیجن پہنچاتا ہے۔ بالکل اصلی خون کی طرح۔ یہ مصنوعی خون میرے ہی ملک کے سائنس دان ڈاکٹر جے ناٹو نے سب سے پہلے تیار کیا اور اس کا نام ایف ڈی اے (FDA) رکھا۔ اس زمانہ میں یہ تجربہ بھی کیا گیا کہ ایک بچھڑے کے جسم سے سارا اصلی خون نکال کر یہ مصنوعی خون اس کی جگہ داخل کر دیا گیا۔ مصنوعی خون دو گھنٹے تک اس کے جسم میں دوڑتا رہا۔ پھر اسے نکال کر اصلی خون دوبارہ داخل کر دیا گیا تو اس بچھڑے کی زندگی معمول کے مطابق جاری رہی۔ بعد میں یہی تجربہ ایک انسان پر کیا گیا اور کامیاب رہا"۔

ڈاکٹر فوکووا چند لمحے کے لئے خاموش ہو گئے اور انھوں نے اخباری نمایندوں پر نظر ڈالی کہ کہیں وہ اکتا تو نہیں گئے۔ لیکن وہ سب بڑے غور سے سن رہے تھے۔ لہٰذا انھوں نے پھر بولنا شروع کیا۔ "اس زمانہ میں مصنوعی خون مہنگا بھی تھا اور اگر یہ زیادہ دیر جسم میں رہتا تو اس کا برا اثر بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے یہاں شمرین کی تجربہ گاہ میں کئی سال تک تجربے کئے اور مجھے یہ کامیابی ہوئی کہ اس کی قیمت بھی کم ہو گئی اور اس کے برے اثرات بھی ختم ہو گئے اور اب یہ مصنوعی خون مستقل طور پر جسم میں رہ سکتا ہے"۔

ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اخباری نمایندے نے سوال کیا "آپ کی اس تحقیق کا صلح نامے سے کیا تعلق ہے؟"

ڈاکٹر فوکووا نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت گہرا تعلق ہے۔ ابھی تو یہ کہانی آپ کو سنا رہا ہوں۔ میرا یہ تجربہ تو کامیاب ہو گیا لیکن ایک عجیب بات ہوئی جو میں خود بھی ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ زلزلے کے بعد جن زخمیوں کو مصنوعی خون دیا گیا وہ امن پسند بن گئے۔ جتنا زیادہ مصنوعی خون کسی کے جسم میں پہنچا وہ اتنا ہی زیادہ امن پسند بن گیا۔ تمار اور رفضیل بھی زخمی حالت میں ہسپتال میں داخل ہوئے۔ انھیں مجبوراً ہم نے مصنوعی خون دیا۔ پھر بعد میں اور لوگوں کو بھی یہی خون دیا گیا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ جن لوگوں کے جسم میں مصنوعی خون دوڑ رہا ہے انھوں نے کوشش کر کے صدیوں پرانی دشمنی ختم کر دی"۔

اخباری نمایندے حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور ایک نمایندے نے سوال کیا "تو کیا یہ اصلی خون ہے جو انسان کو جھگڑے اور دشمنی پر اکساتا ہے؟"

ڈاکٹر فوکووا نے کہا "میں نے تو یہ بات نہیں کہی"۔

ایک اور نمائندہ کھڑا ہو گیا اور بولا "آپ نے یہ بات کہی نہیں لیکن آپ کی باتوں سے یہی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ سارا فساد انسانی خون کا ہے"۔

ڈاکٹر فوکووا نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ جو کیمیائی اجزا میں نے مصنوعی خون بنانے میں استعمال کئے ہیں ان میں سے کسی جزو نے دماغی خلیوں پر اتنا اچھا اثر ڈالا ہو کہ انسانی دماغ پر چھائی ہوئی دشمنی اور فساد دب گیا ہو اور انسان امن پسند بن گیا ہو۔ بہرحال میری تحقیق ابھی جاری رہے گی۔ یہ اصلی خون کی خرابی ہو یا نقلی خون کی اچھائی۔ میری تو یہ کوشش ہو گی کہ میں یہ نقلی خون زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دوسرے ملکوں کے سائنس دانوں نے مجھ سے تعاون کیا تو ہمارا تیار کیا ہوا یہ مصنوعی خون دنیا سے دشمنی اور فساد ختم کر سکے گا اور دنیا میں امن قائم ہو سکے گا اور میری طرف سے یہ تمام انسانوں کے لئے امن کا تحفہ ہو گا"۔

☆ ☆ ☆

قصور کسی کا، سزا کسی کو

چوتھی قسط — سید نظر زیدی

کلو اور للو دونوں بھائی پڑھنے کے لیے توحید کے پاس آنے لگے تھے اور کلو کی ذہانت اور شوق دیکھ کر توحید حیران رہ گیا تھا۔ یہ دونوں قدرتاً ذہین اور سمجھ دار تھا کہ اشاروں کی زبان تک سمجھتا تھا۔ توحید جو سبق پڑھاتا تھا وہ اسے ایسی اچھی طرح یاد کرتا تھا گویا پہلے سے پڑھ رکھا ہو۔ صدیقی صاحب نے اس خاندان کے تمام لوگوں کے لیے دو دو جوڑے کپڑے اور نئے بستر بنوا دیے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری ضرورتوں کے لیے نقد روپے بھی دیے تھے۔ یوں اس غریب خاندان کی زندگی اب کچھ اچھی ہو گئی تھی۔ ایک مہینے کے اندر ہی سب کے چہروں پر رونق آ گئی تھی اور وہ ایسے سلیقے اور تمیز سے باتیں کرنے لگے تھے گویا ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔

چوہدری کا لباس اب سفید گاڑھے گہرے رنگ کی دھاریوں والی قمیص اور ٹخنے تک صاف ستھرا تہبند بن گیا تھا۔ کام کرنے کے لیے اس نے سلیٹی رنگ کا ایک جوڑا سلوا لیا تھا۔ کام شروع کرنے سے پہلے وہ گھر والے کپڑے اتار کر دوسرے پہن لیتا تھا اور کام ختم کرنے کے بعد نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہنے گھر آتا تھا۔ لباس اور صفائی اور پاکیزگی کی وجہ سے اس کی چال ڈھال تک میں وقار پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ سچ مچ چوہدری نظر آتا تھا۔

کلو اور للو کی ماں کو کسی طرح یہ پتا چل گیا تھا کہ توحید میاں ہمارے گھر کی چائے اس لیے نہیں پیتے کہ ہمارے برتن صاف ستھرے نہیں۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے چینی کی ایک عمدہ کیتلی اور چینی کے بنے ہوئے پرچ پیالے منگائے تھے۔ اپنے گھر کو بھی جھاڑ پونچھ کر صاف ستھرا کر لیا تھا۔

توحید جب بھی وہاں جاتا تھا تو ان لوگوں کے حالات میں ایسی شان دار تبدیلی دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتا تھا۔ اور واپس آ کر جب اپنے ابو اور امی کو ان کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتاتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے اور اس بات کے لیے اللہ پاک کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے غریبوں کے ساتھ یہ نیکی کرنے کی توفیق دی۔

کلو اور للو دونوں بھائی مغرب کی نماز کے بعد سبق پڑھنے آیا کرتے تھے۔ سیر سے واپس آ کر کھانے کے وقت تک توحید کو کوئی کام نہ ہوتا تھا اس لیے ان دونوں بھائیوں کو پڑھانے میں اسے معمولی سی الجھن بھی نہ ہوتی تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں آتے تھے سبق شروع ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات سبق سے پہلے کچھ گپ شپ بھی ہو جاتی تھی۔

آج دونوں بھائی آئے تو سبق شروع ہونے سے پہلے خدا جانے توحید کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے کلو کی طرف دیکھ کر اچانک سوال کیا "کیوں کلو میاں یہ تو بتاؤ جس دن تم ہمارے باغیچے میں آئے تھے تمھیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اجازت کے بغیر کسی کی چیز لے لینا سخت گناہ ہے؟"

"جی بالکل نہیں" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمیں گناہ اور ثواب کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ ہم تو بس یہ سمجھتے تھے کہ جس چیز کو دل چاہے اور وہ آسانی سے مل بھی سکتی ہو تو اسے لے لینا چاہیے" کلو نے سادگی سے جواب دی۔

"اور اگر اب کسی چیز کو تمھارا دل چاہے اور وہ آسانی سے مل بھی سکتی ہو تو کیا اب بھی لے لو گے؟" توحید نے سوال کیا۔

کلو جلدی سے بولا "جی بالکل نہیں۔ اب تو مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ چاہے جتنی ضرورت ہو دوسروں کی چیز ان کی اجازت کے بغیر نہیں لینی چاہیے۔ اگر ایسا کیا جائے تو یہ چوری ہو گی

اور چوری اتنا بڑا گناہ ہے کہ قرآن مجید میں چور کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہے"۔

"شاباش بھئی شاباش! ارے تو گویا تم نے اس پورے معاملے کو ہی اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ بے شک یہ بات یونہی ہے اور اس میں یہاں تک احتیاط برتنی چاہیے کہ سخت ضرورت کے وقت بھی اجازت کے بغیر کسی کی چیز نہیں اٹھانی چاہیے۔ مثال کے طور پر ہمیں سخت بھوک لگ رہی ہو اور کسی کے باورچی خانے میں تازہ خوشبودار اور لذیذ کھانا رکھا ہو تو ہمیں وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ ایک نوالہ بھی نہیں اٹھانا چاہیے" توحید نے کلو کی کمر تھپک کر کہا۔

"جی یہ ساری باتیں ہمیں تسنیم بی بی نے بتائی تھیں اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا تھا کہ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جس کا وہ کھانا ہو شاید اسے اس کی ضرورت ہم سے بھی زیادہ ہو۔ اور جناب ساتھ ہی تسنیم بی بی نے یہ بھی سمجھایا تھا کہ جو بات ہم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اسے دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔ جیسے ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی چپکے سے ہماری کوئی چیز اڑا لے یا زبردستی ہمارے مال پر قبضہ کر لے تو ہمیں خود بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے" کلو نے جوش بھری آواز میں کہا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو تا تھا یہ باتیں جان کر اسے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوئی ہے۔

"بھئی واہ کلو میاں! ارے تو گویا تم نے حضرت محمدؐ کی یہ حدیث شریف یاد کر لی "جو بات تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرو"" توحید نے کہا۔

"پھر تو یہ اور بھی خوشی کی بات ہے جی۔ اللہ پاک کو منظور ہوا تو میں اس حدیث شریف پر ساری زندگی عمل کروں گا" کلو نے ایسی آواز میں کہا جس سے پکا ارادہ ظاہر ہوتا تھا۔ للو نے بھی سر ہلا کر ایسا ہی کرنے کا وعدہ کیا۔

اب یہ بات ایک طرح ختم ہو گئی تھی اور وہ ایک سبق شروع کرنے والے تھے کہ توصیف آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ چھوٹا قسطانی بھی تھا۔ توصیف آتے ہی غصے بھری آواز میں بولا "بھائی جان! ان چوروں کو اپنے گرد اکٹھا کر کے آپ کو شاید جنت میں جگہ مل جائے گی مگر ہمارے لیے یہ اچھی بھلی دنیا ہی دوزخ بن گئی ہے!"

اس خاندان کے چھوٹے بڑے سب آپس میں نہایت ادب سے گفتگو کرتے تھے خاص طور پر چھوٹی عمر والوں کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری تھا کہ رشتوں کا پوری طرح احترام کریں۔ توحید چونکہ عمر میں بڑا تھا اس لیے سب بھائی بہن اس کا ادب کرتے تھے۔ لیکن اس وقت توصیف نے اس انداز سے بات کی تو توحید حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور جب اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ ایسی گستاخی سے کیوں بولا ہے تو اپنی عادت کے مطابق نرم آواز میں بولا "کیوں میاں کیا بات ہوئی جو اس قدر غصہ ظاہر کر رہے ہو؟"

"بات بتانے سے بھی کیا ہو گا بھائی جان! آپ کوئی ہمارے حال پر رحم تھوڑا ہی کھائیں گے۔ آپ کو تو اب سب سے زیادہ خیال اپنے ان لاڈلوں کا ہے" توصیف نے پہلے کی طرح غصے بھری آواز میں کہا۔

"یہ بات سمجھ کر کہ چھوٹے میاں ہم دونوں پر ناراض ہو رہے ہیں"۔ کلو اور للو بھی حیران حیران نظروں سے توصیف کی طرف دیکھنے لگے۔

توحید اب کچھ کچھ بات سمجھ چکا تھا۔ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا "دیکھو! میاں چاہے کیسی بھی ناراضگی کی بات ہو گفتگو شریفوں کی طرح کرنی چاہیے۔ تم اپنے ناراض ہونے کا سبب تو بتاتے نہیں بس غراتے چلے جا رہے ہو!"

"سب کیا بتاؤں جناب! ان حضرات نے جنھیں آپ پڑھا لکھا کر عالم فاضل اور خدا جانے کیا کچھ بنانا چاہتے ہیں میری وہ گھڑی غائب کر دی ہے جو چچی جان نے جرمنی سے بھیجی تھی۔ میرے لیے جانے کیا یہ ظلم نہیں؟" توصیف نے روہانسا ہو کر کہا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے گھڑی گم ہو جانے کا سخت صدمہ ہے۔

چھوٹے قسطانی نے بے ضرورت ہی اس کی تائید کی۔ "کیسی بڑھیا گھڑی پر ہاتھ صاف کیا ہے ان چوروں نے!"

"کیا وہ گھڑی گم ہو گئی؟" توحید نے حیرت ظاہر کی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن پیارے بھائی اگر یہ نقصان ہوا ہے تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ گناہ ان لوگوں نے کیا ہے؟"

"خدا کو دیکھا کسی نے نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ ان دونوں

کی بات چرانے کا علم تک نہیں۔ آپ بھول گئے ان کا تعارف کس حیثیت سے ہوا تھا؟" توصیف نے تیز آواز میں کہا۔

"توحید بھائی یہ تو ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں کہ آنکھوں میں سے سرمہ اڑا لیں" چھوٹے قسطانی نے کلو اور للو کو گھورتے ہوئے کہا اور وہ بے چارے سب ہی کے ساتھ توحید کی طرف کھسکنے لگے۔

"میرے بھائی خدا کا حکم ہے کہ بدگمانی سے بچو۔ جب تک پکا ثبوت نہ مل جائے کسی کے سر الزام نہ تھوپو" توحید نے سمجھانے کے انداز میں کہا لیکن اس کی اس بات کا توصیف پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے کی طرح بگڑ کر بولا:

"مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ آپ انہیں بے گناہ اور مجھے جھوٹا ثابت کریں گے۔ اصل میں غلطی خود میری ہے۔ یہ بات مجھے ابا جان سے کہنی چاہیے تھی آپ سے کہنے چلا آیا"۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا توحید صاحب سے کہنا بے کار ہے" چھوٹے قسطانی نے لقمہ دیا۔ کلو اور للو بے چارگی کی تصویر بنے ان دونوں بھائیوں کی باتیں سنتے رہے۔ تھوڑی دیر پہلے دونوں کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے لیکن اب ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ توحید نے ان کی طرف دیکھا تو ان کی حالت دیکھ کر اسے بہت رنج ہوا۔ وہ تیز آواز میں بولا "تم چاہو تو اپنا یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں لے جاؤ لیکن میں بھی یہ بتائے دیتا ہوں کہ پکا ثبوت ملے بغیر انہیں اف تک نہ کہنے دوں گا"

"اب اس کا فیصلہ تو ابا جان ہی کریں گے کہ ان دونوں کو انعام ملنا چاہیے یا سزا۔ آپ سے جھگڑا کرنے کا فائدہ؟" یہ کہہ کر توصیف کمرے سے نکل گیا اور چھوٹا قسطانی بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

دوسرے دن یہ مقدمہ صدیقی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ توصیف نے پورے یقین کے ساتھ کہا "میری گھڑی کلو اور للو کے سوا کسی نے نہیں چرائی"۔ توحید نے نہایت سختی سے اس بات کو غلط بتایا۔ گھڑی گم ہو جانے کی خبر سننے سے ذرا دیر پہلے جو باتیں ہو رہی تھیں ان کی بنا پر توحید کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ دونوں بھائی اب تمام زندگی برائی کے نزدیک بھی نہ جائیں گے۔

اس کے مقابلے میں توصیف پھولوں کی چوری کے واقعے کو اپنی بات کی سچائی کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہا تھا اور چھوٹا قسطانی جو اس کا وکیل بنا ہوا تھا، اس بات پر زور دے رہا تھا کہ ان دونوں کو سخت سزا ملنی چاہیے!

صدیقی صاحب کے سامنے وہ غصہ یا نفرت تو ظاہر نہ کر سکتے تھے لیکن ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں فریق اپنی اپنی بات

سلوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ دونوں کی باتیں سن کر صدیقی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے "بزرگوں نے کہا ہے بے دیکھا چور باپ برابر۔ اس کے علاوہ ہمارے مذہب کا بھی حکم ہے کہ جب تک پکا ثبوت نہ مل جائے کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے لیکن ہمارے نزدیک یہ ایسا صاف معاملہ ہے کہ اس میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ توصیف بیٹا غلط بیانی نہیں کر رہا۔ اس کی قیمتی گھڑی یقیناً گم ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں اب سے پہلے ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ اگر پہلے ہی کوئی ایسی بات ہوئی ہوتی تو خیال کیا جا سکتا تھا کہ نوکروں میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ اب تو لامحالہ اس طرف خیال جاتا ہے کہ جو لوگ انہی دنوں آنے جانے لگے ہیں یہ کام انہی میں سے کسی کا ہے!"

اپنے ابو کی یہ بات سن کر توحید روہانسا ہو گیا۔ کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر نہایت ادب سے بولا "ابو! آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل درست ہے لیکن جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ یہ دونوں بچے بے گناہ ہیں۔ اگر انہوں نے پہلے پھول توڑنے کی غلطی کی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ بات معلوم ہی نہ تھی کہ کسی کے باغیچے سے اجازت کے بغیر پھول توڑنا بری بات ہے لیکن اب انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی ہے اور اب یہ کسی صورت میں ایسی غلطی نہیں کر سکتے"۔

"لیکن ابو جی! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جس طرح ان دونوں کو پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ دوسروں کے باغیچے سے پھول توڑنا گناہ ہے اس طرح شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ دوسروں کی گھڑی چرانا گناہ ہے۔ آخر ایسے جاہلوں کا اعتبار ہی کیا؟" توصیف نے کہا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان دونوں بچوں کو پکا چور ثابت کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس سلسلے میں چھوٹا قسطانی اس کا پورا پورا مددگار تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا۔

توحید نے یہ بات پوری طرح محسوس کی لیکن وہ غصے میں نہیں آیا۔ نہایت نرمی سے بولا "عزیز بھائی! نہ عالموں کی کوئی ذات ہے اور نہ جاہلوں کی۔ زیادہ تر یہ تقدیر کے چکر ہیں۔ اگر یہ دونوں بچے جاہل رہے یا اب تک انہیں اچھائی یا برائی کا فرق پوری طرح معلوم نہ ہو سکا تو اس کی وجہ ان کا غریب ہونا ہے۔ اگر یہی بچے ہماری تمہاری طرح کسی خوش حال گھرانے میں پیدا ہوتے تو شاید ان کا اخلاق اور ان کی عادتیں ہم سے بھی اچھی ہوتیں"۔

"اور شاید اس وجہ سے اب انہیں یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ میری گھڑی چرا لیں!" توصیف پہلے کی طرح تیز آواز میں بولا۔

"ارے ارے! ہم محسوس کر رہے ہیں اس واقعے کی وجہ سے تم دونوں کے درمیان ہار جیت کا قصہ پیدا ہو گیا ہے۔ نا میاں! یہ بات تو ہرگز مناسب نہیں۔ تم دونوں میں سے کسی کو بھی ضد میں نہیں آنا چاہیے!" صدیقی صاحب سمجھانے کے انداز میں بولے۔

"ابو جان! میں تو ضد نہیں کر رہا، نہ جانے بھائی جان کیوں ان اچکوں کی وکالت پر آمادہ ہو گئے ہیں" توصیف نے کہا۔ اس کی یہ بات سن کر توحید بے پروائی کے انداز میں ہنسا جیسے اپنے اس بھائی کی نا سمجھی پر افسوس کر رہا ہو۔ پھر بولا "میں ان بے گناہوں کو بے گناہ ثابت کرنا اس لیے ضروری خیال کرتا ہوں ابو جان کہ یہ ہمارے گھر اپنی مرضی سے نہیں آئے بلکہ ہم نے خاص طور پر انہیں بلایا ہے۔ چناں چہ ایسی صورت میں یہ بات کسی طرح بھی درست نہیں کہ انہیں چور کہہ کر ذلیل کیا جائے!"

"تو چلیے قصہ طے ہوا۔ میں اپنی گھڑی کو صبر کیے لیتا ہوں۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ شیر کے منہ کو خون لگ گیا ہے، اب گھر کی دوسری چیزوں کی بھی خیریت نہیں!" توصیف منہ بنا کر بولا۔

بیگم صاحبہ یعنی توحید اور توصیف کی والدہ اب تک خاموش بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھیں۔ توصیف کو ناراض دیکھ کر بولیں "توصیف بیٹے! اگر تمہیں پوری طرح یقین ہے کہ یہ حرکت انہی بچوں نے کی ہے تو ان کے گھر کی تلاشی لے کر سچ جھوٹ پرکھا جا سکتا ہے۔ کیوں جی یہ بات کچھ مشکل تو نہیں؟" بات ختم کر کے انہوں نے صدیقی صاحب کی طرف دیکھا۔

"ہاں مشکل تو نہیں لیکن نامناسب ضرور ہے۔ اس بات سے یقیناً ان لوگوں کی توہین ہوگی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح چپکے سے دیکھ لیا جائے۔ ان کے گھر میں سامان ہی کتنا ہوگا؟" صدیقی صاحب نے کہا اور ان کی یہ بات سن کر توحید نے بے بسی سے سر جھکا

گیا۔ رنج کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن اس کی طرف کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔ گویا ایک طرح یہ طے ہو گیا تھا کہ للو اور کلو کے گھر کی تلاشی ضرور لی جائے۔

چپکے سے چودھری ماجھے کے گھر کی تلاشی لینے کا فیصلہ کرنے کے بعد صدیقی صاحب اور ان کی بیگم نے ادھر ادھر کی اور باتیں شروع کر دی تھیں اور توصیف اپنے دوست قسطانی کو ساتھ لے کر خوشی سے چٹکیاں بجاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا تھا۔ توحید کچھ دیر غم زدہ سا وہاں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر کلو کے گھر کی طرف چل دیا۔ تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ ان غریب بچوں کو تعلیم دینے کی جو نیکی اس نے شروع کی تھی اسے اس جگہ ختم کر دیا جائے۔

توحید مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا جب کلو کے گھر میں داخل ہوا تو کلو کی ماں گھڑونچی کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھی اور کلو اور للو چارپائی پر بیٹھے بڑے شوق سے تختی لکھ رہے تھے۔ ان تھوڑے سے دنوں ہی میں دو اور دو کے چھوٹے چھوٹے جملے اور سو تک گنتی لکھنا سیکھ گئے تھے۔

توحید چودھرائن کو سلام کر کے دونوں بچوں کے پاس جا بیٹھا۔ اسے دیکھ کر تینوں کے چہرے یوں کھل اٹھے جیسے سوکھی کھیتی کو پانی مل گیا ہو۔ چودھرائن برتن اسی طرح چھوڑ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھ کر توحید کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولی "آج میرا بیٹا کدھر راستہ بھول گیا؟"

"بس ایسے ہی چلا آیا چچی جان!" توحید مسکراتے ہوئے بولا۔ ان لوگوں کو مطمئن اور گھر کو صاف ستھرا دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بھول ہی گیا کہ کن پریشانیوں میں گھرا ہوا وہ یہاں آیا تھا۔

"بیٹا مجھے معلوم تھا کہ تم ہمارے میلے اور معمولی برتنوں کی وجہ سے ہمارے گھر چائے نہیں پیتے تھے۔ اسی لیے میں نے نئی کیتلی اور پرچ پیالے منگائے ہیں۔ اگر آج تم نے انکار کیا تو میں سمجھوں گی کہ تم ہم سے نفرت کرتے ہو!" چودھرائن نے بڑے پیار سے کہا اور پھر دوپٹے کے پلو سے پیسے کھول کر کلو کو دیتے ہوئے کہا "لے بیٹا جلدی سے دودھ اور بسکٹ تو لے آ!"

"چچی جان! آج میں آپ کا حکم نہیں ٹالوں گا۔ آپ میرے لیے ضرور چائے بنائیے اور اپنی اس پرانی پتیلی میں ہی بنائیے جس میں اپنے لیے بناتی ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا ہے کہ برتن دھو کر تیار کیے ہوئے کھانوں سے انسانیت اور شرافت کا جوہر اڑ جاتا ہے۔"

توحید کو اب یاد آگیا تھا کہ اس وقت وہ یہاں کیوں آیا ہے اور اس کا دل رنج سے ڈوبنے لگا تھا۔

چودھرائن اس کی اس بات کو مذاق سمجھی۔ وہ بے چاری نہ انسانیت کا مطلب سمجھتی تھی نہ جوہر کا۔ البتہ شرافت اس کا جانا پہچانا لفظ تھا اور وہ بھی اس لیے کہ یہ اس کے بھائی کا نام تھا۔ لیکن اب تو اس کے ساتھ بھی دو لفظ ایسے کہے گئے تھے جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا اور اس نے تمام چیزیں کی چیلی ہوئی پتیلی لا کر چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔

لکڑیاں گیلی اور چولہا ٹوٹا ہوا تھا اس لیے چائے تیار ہونے میں کافی دیر لگ گئی۔ اس عرصے میں توحید اپنے شاگردوں کو سبق پڑھاتا رہا۔ چائے تیار ہو گئی تو اس نے ان سب کے ساتھ مل کر چائے پی

اور سچ یہ ہے کہ جو لطف اسے اس غریب مزدور کے گھر کی چائے میں آیا وہ اسے زندگی بھر حاصل نہ ہوا تھا۔ ان لوگوں کی عاجزی اور باتوں کی مٹھاس نے اس چائے میں سچ مچ شہد گھول دیا تھا۔

چائے پینے کے بعد توحید تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اس نے بڑے ہی دکھے ہوئے دل سے ان بچوں کو یہ بتایا کہ اب ان کے سبق کا سلسلہ جاری نہ رہ سکے گا اور پھر اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ان لوگوں کو اصل وجہ تو نہ بتا سکتا تھا اس لیے یہ بہانہ کیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے ملتان جا رہا ہوں۔ یہ بات سن کر دونوں بچے چپ سے ہو گئے۔ انہیں ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا اور وہ سمجھ گئے کہ اب ہماری تعلیم جاری نہ رہ سکے گی۔

چودھری ماجھے کے گھر سے اٹھ کر توحید اپنی کوٹھی آیا تو صدیقی صاحب اور ان کی بیگم گھڑی کے بارے ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ توحید اب گفتگو میں حصہ نہ لینا چاہتا تھا۔ اس لیے ایک طرف خاموش بیٹھ گیا۔ صدیقی صاحب نے اسے اداس دیکھا تو بولے "بیٹا اس میں شک نہیں کہ کمزوروں اور غریبوں کی مدد کرنا فرض ہے اور یہ بات بھی بہت ضروری ہے کہ ان کا دل نہ دکھایا جائے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ غلط کاموں پر ٹوکنا بھی ان کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ زیادہ تر لوگوں کی عادتیں اسی لیے بگڑتی چلی جاتی ہیں کہ برے کام کرنے کے بعد بھی انہیں کسی قسم کی سزا نہیں ملتی۔ یہی وہ بات ہے جس کو سامنے رکھ کر ہم مجرموں کو پکڑنا اور ان پر ان کا گناہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں اس بات پر ہرگز رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے!"

اپنے ابا جان کی یہ بات سن کر توحید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ تسنیم تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سانس پر قابو پاتے ہوئے بولی "توحید بھائی! خانساماں کو بازار بھیج کر جلدی سے مٹھائی منگوایئے آپ کے لیے خوش خبری لائی ہوں!"

سب تسنیم کی طرف دیکھنے لگے۔ امی نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا بات ہے بیٹی! اندازہ ہوتا ہے کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے تمہیں!"

"خاص بات کیا امی جان! ان بڑی بی کو مل گیا ہو گا کوئی مرا ہوا چوہا۔ یہ تو عام طور پر ایسی ہی شان دار باتوں سے خوش ہوا کرتی ہیں" توحید نے خوش ہو کر کہا۔ اپنی اس سادہ دل اور بھولی بھالی بہن کو مسرور دیکھ کر وہ اپنے دل میں گدگدیاں سی محسوس کیا کرتا تھا اور کوئی ایسا ہی فقرہ چست کر کے اسے چڑانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ لیکن آج تسنیم چڑی نہیں بلکہ اسی طرح خوشی بھری آواز میں بولی: "بالکل سچ کہہ رہی ہوں بھائی جان! آپ کے لیے بہت بڑی خوش خبری لائی ہوں۔ یہ دیکھیے!" یہ کہہ کر تسنیم نے مٹھی کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر توصیف کی وہی گھڑی چمک رہی تھی جس کے چوری ہو جانے کا یقین کر لیا گیا تھا اور اب یہ بات ضروری سمجھی جا رہی تھی کہ کلو کے گھر کی تلاشی لی جائے؟

"ارے! یہ تو توصیف کی گھڑی ہے۔ کہاں سے ملی یہ تمہیں؟" توحید خوشی سے اچھل پڑا اور جلدی سے گھڑی لے لی۔

"بھائی جان میں توصیف بھائی کی میز صاف کر رہی تھی۔ یہ گھڑی ان کے قلم دان کے پیچھے سے ملی ہے! دیکھیے وہی ہے نا جس کے گم ہو جانے کا غل مچ رہا تھا؟" تسنیم نے کہا۔

"ہاں بھئی بالکل وہی ہے۔ ہمارا خیال ہے خود توصیف ہی نے یہ گھڑی اس جگہ رکھی ہو گی اور پھر بھول گئے ہوں گے" توحید نے کہا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہے لیکن اس لڑکے کی اس بھول نے ہم سب کو کیسے گناہ میں مبتلا کر دیا۔ ہم سب یہ یقین کر رہے تھے کہ گھڑی ضرور ان بچوں نے چرائی ہے۔ ہمارے اس گناہ کو خدا معاف کرے۔ کہاں ہے وہ لڑکا؟" صدیقی صاحب افسوس بھرے لہجے میں بولے اور سر جھکا کر توبہ کرنے لگے۔

توحید کی والدہ صاحبہ بھی اس بات پر افسوس کرتی رہیں کہ ان بے گناہوں پر خواہ مخواہ چوری کا الزام لگایا گیا۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "محض شک کی وجہ سے ہم نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ میں تو سجدے میں سر رکھ کر خدا سے معافی مانگوں گی"۔

"خود ہم بھی بہت شرمندگی محسوس کر رہے ہیں بیگم!" یہ کہہ کر صدیقی صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے جاتے جاتے کہا "یہ بات توصیف کو ضرور بتا دینا بیٹی! ایسا نہ ہو وہ تلاشی لینے چودھری کے گھر پہنچ جائے!"

☆ ☆ ☆

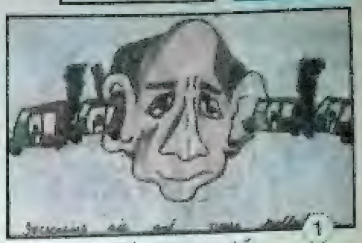

ہونہار مصور

رکشہ اور اس کا دھواں

[illegible] لاہور ([illegible] 150 روپے کی کتابیں)

نوید [illegible] (دوسرا انعام [illegible] روپے کی کتابیں)

اشتیاق احمد ساقی اوکاڑہ (تیسرا انعام 100 روپے کی کتابیں)

ماجد رشید لاہور (چوتھا انعام 80 روپے کی کتابیں)

سید عمران ساجد جھنگ صدر (پانچواں انعام 40 روپے کی کتابیں)

سید شاہین العقاب لاہور (چھٹا انعام 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی تھیں: ساجد محمود سرگودھا۔ حلیمہ سیف اللہ منڈی بہاءالدین۔ محمد رفیع اللہ طاہر راولپنڈی۔ شاہد اقبال اوکاڑہ۔ سعدیہ نورین گوجرانوالہ۔ احسن رضا گل لاہور۔ محمد نعیم ساہی وال۔ محمد رضوان محمد زکریا کراچی۔ وقاص نواز فیصل آباد۔ سید حسن عباس لاہور۔ عطرت گل لاہور۔ سید علی یاطق زیدی اسماعیل خان۔ راجہ اسحاق غوری لاہور۔ نائلہ محفوظ کیانی، راولپنڈی۔ ستارہ شاہ لاہور۔ محسن نعیم بھٹی خانپور۔ شگفتہ مریم سیالکوٹ۔ انعم افضل بنگلا دیم۔ ثمیر عزیز میرپور خاص۔ یاسر عرفات منڈی بہاءالدین۔ محمد عمران حیدر قیصرانی ملتان۔ عمارہ طارق (مقام نہیں لکھا)۔ طلحہ محمود جہلم۔ عمر نعیم کوئٹہ۔ سدرہ مسلم جاوید گوجرانوالہ۔ ثنا جاوید لاہور۔ بشریٰ لیاقت لاہور۔ زینب یاسمین سرگودھا۔ تحریم جاوید لاہور۔ سلمان محمود سلطان کراچی۔

دلچسپ اور ناقابلِ یقین

قائد کا قول

برطانوی مصنف ہیکٹر بولیتھو نے 1954ء میں جو کتاب لکھی تھی "جناح' پاکستان کے خالق" اس کی ابتدا میں قائداعظم کا یہ قول درج ہے "ناکامی وہ لفظ ہے جس سے میں نا آشنا ہوں" نپولین کا یہ قول "لفظ ناممکن بے وقوفوں کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے" پاکستان بھر میں معروف ہے۔ لیکن قائداعظم کے اس قول سے قوم آگاہ ہی نہیں ہے۔ ہے نا حیرت کی بات۔

مسکرانا منع ہے

یونان کے بیش تر دیہاتی علاقوں میں یہ رسم ہے کہ جس عورت کا خاوند مر جائے اس کے سامنے دو سال کے عرصے تک نہ کسی کو ہنسنے کی اجازت ہے اور نہ مسکرانے کی۔ وہ جس محفل میں موجود ہو وہاں کسی کو ہنسی مذاق کی اجازت نہیں۔ اس کی موجودگی میں ہر کسی کو افسردہ رہنا پڑتا ہے۔ اس انوکھے ماتم یا سوگ کا عرصہ دو سال تک ہوتا ہے۔

کھوپڑی گلے میں

افریقہ کے ملک نیوگنی کے علاقے مارخام میں جب کوئی مرد مرجاتا ہے تو اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر لیا جاتا ہے پھر اس سے گوشت پوست الگ کر کے کھوپڑی میں سے رسی گزاری جاتی ہے۔ یہ رسی مرنے والے کی بیوہ کے گلے میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس طرح خاوند کی کھوپڑی کئی سالوں تک ہر وقت بیوہ کے گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔

خاوند کی لاش کے ساتھ

ملائیشیا کے قبائلی علاقوں میں جب کسی عورت کا خاوند مرجاتا ہے تو خاوند کی لاش ایک خاص کیمیائی عمل سے محفوظ کر لی جاتی ہے اور اسے کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ تین سال گھر کے ایک خاص کمرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ بیوہ کو یہ تمام عرصہ اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ کمرے میں ہی گزارنا پڑتا ہے۔ جب یہ عرصہ پورا ہو جاتا ہے تو قبیلے کے لوگ لاش کو اٹھا لے جاتے ہیں اور ایک اونچے پہاڑ کی نصف بلندی پر پہلے سے بنائے ہوئے غار میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ غار ایسی جگہ بنایا جاتا ہے جہاں کوئی درندہ نہیں پہنچ سکتا۔

بہن کے گلے میں بہن کی کھوپڑی

بحر ہند میں جہاں خلیج بنگال ختم ہوتی ہے' جزائر انڈمان واقع ہیں۔ یہی وہ جزائر ہیں جو کالا پانی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہاں جنگلی لوگ رہتے ہیں۔ وہاں کا ایک رواج ہے کہ کسی لڑکی کی چھوٹی بہن مر جائے تو مرنے والی کا سر کاٹ لیا جاتا ہے۔ اس سے گوشت پوست الگ کر کے کھوپڑی میں سے رسی گزاری جاتی ہے۔ اسی رسی سے بڑی بہن کھوپڑی کو اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے۔ اس طرح بڑی بہن کے گلے سے چھوٹی بہن کی کھوپڑی دس سال تک لٹکتی رہتی ہے۔

انوکھا ماتم

اتھوپیا میں اسلا نام کا ایک قبیلہ ہے۔ اس قبیلے میں جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کی بیوہ اپنے آپ کو سات سال تک چمڑے کے ہنٹر سے مارتی رہتی ہے۔ یہ ہنٹر خاص قسم کے چمڑے کا بنا ہوتا ہے جو قبیلے کے سردار کے پاس رہتا ہے اور خاوند کی موت پر اس کی بیوہ کو دے دیا جاتا ہے۔ وہ ہر روز کچھ دیر کے لیے اس سے اپنے آپ کو پیٹتی ہے۔ جسے خاوند کا ماتم کرنا کہتے ہیں۔ یہ ماتم سات سال تک جاری رہتا ہے۔

انوکھا احتجاج

جولائی 1979ء میں پٹرول کی قیمتوں کے خلاف احتجاج کے طور پر امریکا میں ایک آدمی نے اپنے آپ کو زندہ درگور رکھا۔ وہ یہ کہ کر اپنی قبر میں اترا تھا "جب تک پٹرول کی قیمتیں نیچے نہیں آئیں گی میں اوپر نہیں آؤں گا"۔ دس روز بعد اسے ڈاکٹروں کی سفارش پر قبر سے نکال لیا گیا۔ اس آدمی کا نام ہربرٹ اوڈیل اسمتھ تھا اور اس وقت اس کی عمر 64 سال تھی۔ وہ پیشہ ور سٹنٹ مین تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سٹنٹ مین کیا کیا کرتے ہیں۔ یہ اکثر فلموں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہیرو کو گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہو تو دور کا منظر فلمایا جاتا ہے۔ مگر گھڑ سوار ہیرو نہیں سٹنٹ مین ہوتا ہے۔ جسے خطرناک گھڑ سواری کی مہارت ہوتی ہے۔ ہیرو کی کار کو آگ لگ جائے تو کلوز اپ ہیرو کا دکھایا جاتا ہے لیکن شعلوں میں سے جب ہیرو نکلتا ہے تو وہ سٹنٹ مین ہوتا ہے۔ بعض اوقات دکھایا جاتا ہے کہ فلم کے کسی اہم کردار کے تمام کپڑوں کو آگ لگی ہوئی ہے۔ ان شعلوں میں اہم کردار نہیں بلکہ کوئی سٹنٹ مین ہوتا ہے۔ سمندر میں بہت اونچی چٹان سے چھلانگ لگانے کے مناظر اکثر دور سے فلمائے جاتے ہیں۔ مگر اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے والا ہیرو یا ولن نہیں سٹنٹ مین ہوتا ہے۔ ہربرٹ اوڈیل اسمتھ بھی ایسا ہی سٹنٹ مین تھا۔ اس نے زندہ درگور ہونے میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ یہ مہارت اس کا پیشہ تھا۔ اسے وہ احتجاج کے طور پر پہلے بھی کئی موقعوں پر استعمال کر چکا تھا۔ جولائی 1979ء میں پٹرول کی مہنگائی سے تنگ آئے ہوئے کچھ زندہ دل لوگوں نے ہربرٹ اوڈیل اسمتھ کو راضی کر لیا کہ وہ احتجاج کے طور پر زندہ دفن ہو جائے۔ اس نے ایک تابوت بنوایا جس کی لمبائی چھ فٹ' چوڑائی تقریباً ایک گز اور اونچائی اتنی تھی کہ وہ آسانی سے اس میں بیٹھ سکتا تھا۔ تابوت کے نیچے اس نے بیت الخلا کے طور پر ایک ٹینکی فٹ کرائی۔ تابوت میں ایک پیری اسکوپ بھی لگوائی۔ وڈیو

6 ستمبر

ضیغم حمیدی

چھ ستمبر کا دن، عزم و ہمت کا دن
پاک پیارے وطن کی حفاظت کا دن
یہ وہ دن ہے کہ جس دن مرے ملک پر
چھپ کے بھارت نے ناپاک حملہ کیا
اور ہم نے اسے دی اک ایسی شکست
آپ ہی شرم سے اس کا سر جھک گیا
پاک افواج کی استقامت کا دن
چھ ستمبر کا دن، عزم و ہمت کا دن
یہ وہ دن ہے کہ جب ہم نے ثابت کیا
متحد ہم، بہادر، نڈر قوم ہیں
ہم کو ہے اپنی جاں سے یہ پیارا وطن
ایک آزاد، سینہ سپر قوم ہیں
جرأت و حوصلے کا، شجاعت کا دن
چھ ستمبر کا دن، عزم و ہمت کا دن
آؤ! پھر آج کے دن یہ وعدہ کریں
اتحاد اپنا قائم رکھیں گے سدا
کل بھی ہم ایک تھے، آج بھی ایک ہیں
ہم نہ ایک دوسرے سے اب ہوں گے جدا
اک نئی زندگی کی حرارت کا دن
چھ ستمبر کا دن، عزم و ہمت کا دن

کارٹون
کہانی

اب اس طرح جھولنے اور اپنی مرضی سے
جہاں چاہیں جانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے
لیکن یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ لالچی کوا اپنی
جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ وہ تو اپنی
جگہ پر بیٹھا بیٹھا
ہی مر گیا۔

یادگار لمحے

سیدہ طیبہ ہاشمی

ہم ہر سال اپنے ننھیال گرمیوں کی چھٹیاں منانے جاتے ہیں مگر اس دفعہ ہم نے سوچا کہ کوئی تاریخی مقام دیکھا جائے۔ ذی شان اور ریحان نے ہڑپہ جانے کی تجویز پیش کی۔

ہڑپہ وادی سندھ کا ایک تاریخی شہر ہے یہ لاہور سے تقریباً 116 میل کے فاصلے پر ضلع ساہی وال میں واقع ہے۔

نسال اور ایمن نے روہتاس کا نام لیا۔ روہتاس ایک قلعہ ہے جو فرید خاں (شیر شاہ سوری) نے مغل شہنشاہ ہمایوں جو کہ شکست کھا کر ایران بھاگ گیا تھا کی واپسی کے خطرے کو دیکھتے ہوئے جہلم کے قریب موضع دینہ (موجودہ جی ٹی روڈ) سے چند میل کے فاصلے پر بنوایا تھا۔ مگر میں تو ٹیکسلا کی دیوانی تھی۔ لہٰذا میں نے ٹیکسلا جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ کیونکہ میں نے ٹیکسلا کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ پاکستان کا قدیم ترین شہر ہے۔ جو تاریخ میں اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔

اباجان نے ان تینوں مقامات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے لئے کہا۔ مگر ہم سب اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ہم سب کا اصرار دیکھ کر اباجان نے مشورہ دیا کہ پرچیاں ڈال لی جائیں۔ پرچیاں ڈالی گئیں تو خوش قسمتی سے ٹیکسلا کا نام نکل آیا۔ میری خوشی کی تو انتہا نہ رہی۔

اباجان نے کہا کہ کل میں ٹکٹیں لے آؤں گا اور پرسوں یعنی اتوار کے روز ہم راولپنڈی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ہم سے وہ ایک دن بھی گزارنا مشکل تھا۔ آخر خدا خدا کر کے اتوار کا سورج طلوع ہوا۔ ہم صبح 6 بجے تیار ہو کر لاری اڈے کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور پھر کچھ دیر بعد ہی بس میں سوار ہو چکے تھے۔ بس لاہور کے ماحول سے باہر نکل رہی تھی۔ فضا میں عجیب طرح کی تازگی کا احساس جاگ رہا تھا۔ سب لوگ شیشوں سے باہر سرسبز کھیتوں کے حسین مناظر دیکھنے میں مشغول تھے۔ البتہ اباجان اس عرصے میں اخبار کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرتے رہے۔

اب بس گوجرانوالہ شہر کے قریب سے گزر رہی تھی۔

"بچو! یہ شہر پہلوانوں کی وجہ سے بہت شہرت رکھتا ہے" اباجان نے اخبار تہ کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر کہا اور ہم بڑے اشتیاق سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ جہاں پہلوانوں کے بجائے بچے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ بس جونہی گجرات میں داخل ہوئی تو رنگ برنگے مٹی کے برتنوں نے خود بخود ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ اباجان نے بتایا کہ اس شہر کے مٹی کے برتن اپنی نفاست اور خوبصورتی میں ملک بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ کھاریاں سے آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دریائے جہلم کو پار کرنے کے بعد ہم جہلم شہر میں داخل ہوئے تو گنجان آبادی اور ٹھنڈی ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ اباجان نے بتایا کہ تاریخ میں اس شہر کی بہت اہمیت ہے۔ یہ شہر تقریباً دو ہزار سال قبل سکندر اعظم نے آباد کیا تھا۔ اس شہر کا نام اس نے اپنے ایک وفادار گھوڑے بیوسی فالا کے نام پر رکھا تھا۔ جسے بعد میں تبدیل کر کے جہلم رکھ دیا گیا۔

پھر باتوں ہی باتوں میں کافی فاصلہ طے ہو گیا اور احساس ہی نہ رہا کہ ہم جہلم شہر کو کتنی دور چھوڑ آئے ہیں۔

بس میں بیٹھے دوسرے مسافر ہمیں اتنی دلچسپی سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھ کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ دینہ کی حدود کو پار کرتے ہی ترقی کا پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ترقی ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام ہے جو جی ٹی روڈ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے نما پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ پہاڑیوں پر تیرتے سرمئی بادل بہت بھلے لگ رہے تھے۔ قریب ہی نیچے ریل گاڑی اپنی مخصوص آواز میں منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

دن کے 2 بجے ہم لوگ فیض آباد لاری اڈے پر پہنچے۔ بھوک کے مارے سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ ذی شان کے پیٹ میں تو چوہوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ اس لیے ٹیکسلا کی طرف

روانہ ہونے سے پہلے ہم نے وہاں کے مقامی ہوٹل سے دوپہر کا کھانا کھایا اور آئس کریم کے کپ پکڑے ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

"اب اور کتنی دور چلنا ہے؟" ذی شان جو پہلے ہی کافی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اکتاہٹ میں بولا۔

"بھئی اتنی جلدی تھک گئے۔ ابھی تو بہت دور جانا ہے"۔ اباجان نے ذی شان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی پشاور روڈ پر فراٹے بھر رہی تھی۔ "اباجان' راول پنڈی سے ٹیکسلا کا کتنا فاصلہ ہے؟" ریحان نے کہا۔

"راول پنڈی سے پشاور جاتے ہوئے ٹیکسلا راول پنڈی سے 27 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے"۔

"اباجان' آپ ہمیں ٹیکسلا کے بارے میں کچھ بتائیں" میں جو آئس کریم کا کپ ہاتھ میں تھامے امین کی بغل میں دبی بیٹھی تھی' قدرے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ضرور ' کیوں نہیں ' لو اب ہم ٹیکسلا کے نام سے پکارے جانے والے مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ یہ ایک خوبصورت تاریخی شہر ہے" انھوں نے شیشے کی اوٹ سے ہمیں سمجھاتے ہوئے بتایا۔

"یہ مارگلہ کیا ہے؟" ریحان جو پہلے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا اب قدرے خوشگوار موڈ میں بولا۔

"یہ جو سامنے بلند و بالا پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا ہے نا' یہی مارگلہ ہے"۔ اباجان نے گاڑی کے بڑے سے شیشے کے اندر سے سامنے قطار کی شکل میں کھڑی ان پہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا جو بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔

"انھیں مارگلہ کی پہاڑیاں کہا جاتا ہے۔ ان کو توڑ کر بجری بنائی جاتی ہے اور ٹرکوں کے ذریعے پورے ملک میں جہاں ضرورت ہو پہنچائی جاتی ہے۔ یہ سڑک پر ٹرک نظر آ رہے ہیں نا' ان میں بجری بھری ہوئی ہے"۔

"اوہو ہماری بات تو درمیان میں ہی رہ گئی" میں نے یاد آنے پر تھا' کہا تو سب یکدم خاموش ہو کر اشتیاق سے اباجان کی طرف دیکھنے لگے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہماری باتیں بہت شوق سے سن رہا تھا اور ہماری چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر مسکرا بھی رہا تھا۔

"ٹیکسلا کو پاکستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ تقریباً سات آٹھ ہزار سال پرانا یہ شہر آج بھی اپنی تاریخی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے اور دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے دلچسپی کا مرکز ہے" اباجان نے بتایا۔

"سات آٹھ ہزار سال پرانا شہر" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں۔

"یہ کیا' ہمارے کئی ایسے شہر ہیں جن کی تاریخ ٹیکسلا کے لگ بھگ ہے جیسے ہڑپہ اور موہن جو ڈرو وغیرہ"۔

میرے سمیت سبھی کی حیرت قابل دید تھی۔ "تو کیا یہ اتنے ہزار سالوں سے آباد چلا آ رہا ہے؟" امین نے نہال کو جوس میں اسٹرا لگا کر دیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹا یہ تب ہی سے آباد چلا آ رہا ہے۔ بہت سے راجاؤں نے یہاں حکومت کی۔ چندر گپت موریہ کے دور حکومت میں تو یہ علم و ادب میں ترقی کے باعث ملک گیر شہرت رکھتا تھا"۔

اباجان نے امین کے سوال کا جواب دیا تو ذی شان نے بڑی معصوم شکل بنا کر دوسرا سوال ان کے سامنے رکھ دیا "یہ چندر گپت کون تھا؟"

"یہ ایک بہادر حکمران تھا۔ اس نے پہلی دفعہ وسیع و عریض ہندوستان کو جو الگ الگ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا منظم کر کے موریہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ چندر گپت کے بیٹے بندوسار کے دور حکومت میں اس کا بیٹا اشوک ٹیکسلا کا گورنر تھا۔ اسے ٹیکسلا اتنا پسند آیا کہ اس نے اپنے دور حکومت میں اسے اپنی راج دھانی کے طور پر منتخب کیا" اباجان نے بتایا۔

"راج دھانی کا مطلب جانتے ہو تم سب" اباجان نے ہم سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ریحان جھٹ بولا "راج دھانی ہندی زبان کا لفظ ہے اسے اردو میں دارالحکومت کہا جاتا ہے"۔

"شاباش" اباجان نے اس کے سر کو پیار سے تھپ تھپایا۔ ہم سب بہت شوق سے اباجان کی باتیں سن رہے تھے کہ ٹیکسی نے اچانک موڑ کاٹا تو اباجان نے ہمارے سوالیہ چہرے دیکھ کر بتایا کہ اب ہم ٹیکسلا کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھروں کے ٹکڑے جگہ جگہ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے

اباجان سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بولے "ان پتھروں کو کاٹ کر ان سے گھریلو استعمال کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ مثلاً سل بٹہ، پیالا، بیلن اور بہت سی چیزیں"۔

"اچھا اچھا ہمارے گھر میں جو سل بٹہ ہے وہ بھی یہاں کا بنا ہوا ہے۔ جس پر دادی جان مہندی پیس کر بالوں میں لگاتی ہیں"۔ ذی شان نے یہاں بھی اچھی یادداشت کا مظاہرہ کیا جو ہم سے کافی بہتر تھی۔

ٹیکسی تقریباً پون گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد میوزیم کے بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے جا رکی۔ ٹکٹیں لے کر ہم میوزیم کے اندر داخل ہوئے تو ہمارے علاوہ وہاں چند غیر ملکی سیاح بھی موجود تھے جو کافی دلچسپی سے چیزوں کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

سامنے موجود مٹی کے لمبے سے مینار نے ہمارے قدم وہیں روک دیے۔ اس کے گرد سات گول گول دائرے سے بنے ہوئے تھے۔ جو اپنی اپنی بناوٹ میں منفرد تھے۔ "اسے چھترا یعنی سات آسمان کہا جاتا ہے اور مہاتما بدھ سے منسوب کیا جاتا ہے" اباجان نے بتایا۔

نہال نے قد آور مجسموں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "ابو' یہ کیا ہے؟"

یہ مہاتما بدھ کے مجسمے ہیں۔ اس کا اصلی نام سدھارتھ تھا اور یہ کھشتری شہزادہ تھا۔ یہ 567 ق۔م میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے بدھ مت کے نام سے ایک نیا مذہب نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگوں نے اس کا مذہب اپنا لیا۔ اشوک کے بارے میں 'میں نے تم لوگوں کو گاڑی میں بتایا تھا نا" انہوں نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا تو ہم سب نے تائید میں سر ہلایا۔

"اس نے بھی ہندو مذہب چھوڑ کر بدھ مت کی پیروی شروع کر دی تھی"۔

پھر چلتے ہوئے ہم بدھا کے اس بڑے سے مجسمے کی طرف چلے آئے جو شاید کھدائی کی وجہ سے جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا مگر دوسرے مجسمے جو کافی بڑے بڑے اور کافی تعداد میں تھے تقریباً اپنی اصلی حالت میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی مورتیاں برتن اور سکے بڑی بڑی الماریوں میں محفوظ تھے۔

اس کے بعد ہم ایک کمرے میں گئے جہاں شیشے کی بنی ہوئی الماریوں میں عام گھریلو استعمال کے چاندی کے برتن تھے جن میں پلیٹیں' چمچے' کٹوریاں وغیرہ شامل تھیں۔ میوزیم سے باہر نکل کر ہم سرکپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ "اباجان اس کو سرکپ کیوں کہا جاتا ہے" ذی شان نے پوچھا۔

"سرکپ ٹیکسلا کا ایک مشہور مقام ہے۔ اس کا نام راجا رسالو اور سات راکھشش کی روایتی داستان سے لیا گیا ہے۔ ان ساتوں میں سے ایک کا نام سرکپ تھا۔ جو انسانی گوشت کھاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس جگہ کا نام اس کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پھر اباجان نے بتایا کہ سرکپ شہر کسی زمانے میں بہت بارونق ہوا کرتا تھا۔ اس شہر میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔

وہاں پہنچتے ہی جس بات نے ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ وہاں چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی تھی۔ اباجان ہم سے آگے آگے چل رہے تھے۔ پھر ہم پتھر کی ایک چھوٹی سی دیوار کے قریب کھڑے ہو گئے۔ "یہ گنبد کیسا ہے؟" میں نے اس بڑے سے گنبد کے بارے میں پوچھا جس کے اردگرد گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایسی ہی گھاس تقریباً ہر کھنڈر میں اگی ہوئی تھی۔

اباجان نے بتایا کہ کسی زمانے میں یہ بارونق شہر ہوا کرتا تھا"۔ پھر اباجان نے اس دیوار کے قریب کھڑے ہو کر بتایا "یہ اس رقاصہ کا گھر تھا جو راجا اشوک کے محل میں رہتی تھی۔ اس کی مورتی کھدائی کے وقت یہاں سے دریافت ہوئی تھی جو آج کل لندن کے عجائب گھر میں ہے۔

"اباجان کیا یہاں بھی انسان رہتے تھے؟" نہال نے کمال معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹا' یہاں انسان ہی تو رہتے تھے"۔

"تو وہ رہتے کہاں تھے؟ یہاں تو کوئی گھر ہی نہیں ہیں" نہال نے کہا۔

"یہ جو تم دیکھ رہے ہو نا یہ گھر ہی ہیں۔ مگر گردش زمانہ کے ہاتھوں ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اب یہ گھر نہیں کھنڈر دکھائی دیتے ہیں" اباجان نے اس کے سر کو پیار سے تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ پھر اباجان نے بتایا کہ اس کے بازار میں سنار کی دکان سے لے کر بڑھئی

کی گھڑی تک ساری ہی سہولیات موجود تھیں یہاں تک کہ وقت معلوم کرنے کے لیے مٹی سے بنی گھڑی بھی ہوتی تھی۔

میں نے ابا جان سے اس چکور سے کھنڈر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اسے سٹوپا یعنی عبادت گاہ کہا جاتا ہے۔ یہاں اس علاقے کے لوگ عبادت کے لیے آتے تھے۔

پھر ہم لوگ اس محل کی طرف بڑھے جو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ "ابا جان یہ محل کس کا ہے؟" ایمن نے ابا جان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ تر لوگ اس محل کو اشوک کا محل کہتے ہیں کیونکہ اپنے دور حکومت میں اس نے ٹیکسلا کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ وہ موریہ سلطنت کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اس نے متحدہ ہندوستان پر تقریباً 40 سال حکومت کی۔ اس کے دور حکومت میں ٹیکسلا نے کافی ترقی کی۔"

چھوٹی سی پہاڑی پر واقع محل جہاں تک جانے کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھی۔ ہم لوگ پیدل ہی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اوپر چڑھ رہے تھے۔ بڑے بڑے پتھروں سے معمولی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ کئی پتھر اپنی جگہ سے اکھڑ چکے تھے اور اوپر چڑھنے میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی۔ مگر ہم لوگ بھی شوق میں ہمت نہیں ہار رہے تھے۔ اوپر پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ ہم کتنی اونچائی پر آ گئے۔ اونچائی سے ٹیکسلا شہر اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ یہاں ابھی کھدائی کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ ابا جان ہمیں اس جگہ سے اونچے کھنڈر کے پاس لے آئے جس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ یہ سٹوپا عبادت گاہ ہے۔ اس کو کنال سٹوپا کہا جاتا ہے۔

"اسے کنال سٹوپا کیوں کہتے ہیں؟" ریحان نے تجسس بھری نظروں سے ابا جان کی طرف دیکھا۔

"اسے کنال سٹوپا اس لیے کہا جاتا ہے کہ کنال راجا اشوک کا بیٹا تھا جو نابینا تھا۔ اس کے باوجود اس نے تقریباً آٹھ سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ راجا اشوک نے اپنے بیٹے کے نام پر اس عبادت گاہ کا نام رکھا۔"

ریحان اور ذی شان کنال سٹوپ کے اوپر چڑھ کر دور دور کا علاقہ دوربین سے دیکھ رہے تھے۔ ایمن ننھے نمال کا ہاتھ پکڑے میرے اور ابا جان کے قریب کھڑی تھی۔ میں نے ریحان اور ذی شان کو نیچے آنے کے لیے کہا کیونکہ اب ہم اس محل کی طرف جا رہے تھے جو سٹوپا کی دائیں جانب واقع تھا۔ محل اپنی حالت سے کہیں سے بھی محل نہیں لگ رہا تھا۔ دور دور تک چار دیواری نظر آ رہی تھی۔ ابا جان نے ہمیں بتایا کہ یہ اشوک کا محل ہے۔ اس محل کے 36 کمرے ہیں۔ ہمیں بھی گننے میں 36 ہی لگ رہے تھے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ محل کے درمیان میں پانی کا بڑا سا تالاب بھی تھا جس میں پانی کا ذخیرہ کیا جاتا ہوگا۔ مگر اب وہاں پانی کے بجائے مختلف جڑی بوٹیاں اور گھاس اگ آئی تھی اور جگہ جگہ پتھر بکھرے پڑے تھے۔ ابا جان نے بتایا کہ اس محل کے بارے میں ماہرین آثار قدیمہ مختلف آرا رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ محل اشوک کے مرنے سے 150 سال بعد بنا۔ اکثریت کی رائے اس سے اتفاق نہیں کرتی اور اسے اشوک کا محل ہی قرار دیتی ہے۔

"محل کے کمرے اتنے تنگ اور چھوٹے کیوں ہیں؟" ایمن نے ایک کمرے میں جھانک کر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اس زمانے میں چھوٹے ہی کمرے بنانے کا رواج ہو گا۔" میں نے اپنی طرف سے تجزیے میں جواب دے دیا تو ابا جان نے بھی میری تائید میں سر ہلایا۔ "ہاں اس زمانے میں ایسا ہی رواج ہو گا۔"

ہر کمرے میں تقریباً ایک آدمی کے سونے کی جگہ موجود تھی یا دیوار میں دیا رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ ابا جان نے بتایا کہ یہ محل [illegible] پرانے زمانے کی یادگار ہے۔ ابا جان نے مزید بتایا کہ ایک اور لحاظ سے بھی ٹیکسلا کی تاریخی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ سکندر اعظم کو ٹیکسلا کے راجا امبھی نے ہندوستان پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔ شام کے تقریباً پونے پانچ کا وقت ہو رہا تھا۔ واپس جانے کے لیے ہم پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے۔ تھکاوٹ سے سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اس پر سکون ماحول سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ یونہی گھنٹوں یہاں بیٹھے رہیں۔ ہم وہاں سے بادل نخواستہ گھر تو پہنچ گئے مگر ابھی تک ہمارا دل وہیں اٹکا ہوا ہے اور آنکھوں کے سامنے وہ تاریخی مناظر ابھی تک گھوم رہے ہیں۔

صحیح حل بھیجئے اور 450 روپے کی کتابیں جیتئے۔

یہ جملے اسی شمارے میں چھپی ہوئی عبارت سے لیے گئے ہیں۔

1۔ اس جذبے کو آپ اپنے اندر خوب ۔۔۔۔۔۔ دیں

2۔ اچھے بچے اپنی ۔۔۔۔۔ کپڑے نہیں گندے کرتے

3۔ فیصل نے اپنا ۔۔۔۔۔ آگے بڑھایا۔

4۔ انگلینڈ کے ڈبلیو جی گریس نے آسٹریلیا کے خلاف ۔۔۔۔۔۔ میں انگلینڈ ٹیم کی قیادت کی۔

5۔ اصل میں ۔۔۔۔۔ وہ بہری ہے۔

6۔ بچے ان گھروں کو ۔۔۔۔۔۔ صاف کیا جائے۔

7۔ ہمارا ملک بھی تو ۔۔۔۔۔ کی طرح ہی ہے۔

8۔ آپ ۔۔۔۔۔ میں رہتے ہیں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

9۔ بے زبان ہیں ۔۔۔۔۔۔ مانگتے ہیں۔

10۔ جو شاید ۔۔۔۔۔ کے دوران میں جگہ جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔

ایک سے زائد درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا اور قرعہ اندازی کے ذریعے چھ انعام بالترتیب 100، 90، 80، 70، 60 اور 50 روپے کی مالیت کی کتابوں کے دیے جائیں گے۔

جوابات داؤدی علمی آزمائش جون 1998ء

(1) قصہ (2) آگ (3) کچی کچی (4) مبارک باد (5) ظالموں (6) بے سکونی (7) قمیص (8) پٹھان (9) فساد کی جڑ (10) ابا کی قمیص

اس ماہ 5115 ساتھیوں کے بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے ان چھ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام دیے جا رہے ہیں۔

○ پہلا انعام: صائمہ فاروق لاوہ چکوال (100 روپے کی کتابیں)

○ دوسرا انعام: فائزہ نیاز زیج روڈ لاہور (90 روپے کی کتابیں)

○ تیسرا انعام: ایقہ باجوری ٹاؤن اسلام آباد (80 روپے کی کتابیں)

○ چوتھا انعام: جاسم عباس کوٹ گلیش چکوال (70 روپے کی کتابیں)

○ پانچواں انعام: تنویر عباس اٹھارہ ہزاری جھنگ (60 روپے کی کتابیں)

○ چھٹا انعام: زارا ملک بوسن روڈ ملتان (50 روپے کی کتابیں)

ان ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کیے جا رہے ہیں: محمد عباس راہوالی۔ حسان احمد رضوی جھنگ صدر۔ شہزاد حسن بھٹی سرگودھا۔ محمد ابرار الحق شاکر لاہور چھاؤنی۔ جواد پاشا لاہور۔ ملک فہیم درانی ملتان۔ شاہ رخ عزیز خان لاہور۔ عثمان علی اے ایم بی۔ محمد عدیل عمران خان کلور کوٹ۔ عظیم احمد ملتان چھاؤنی۔ ظفر نذیر اعوان لاہور۔ لبنیٰ طیبہ قصور۔ انجان بخش لاہور۔ بشریٰ نثار چونیاں۔ سمیرا تحسین لاہور۔ معیز رانا لاہور۔ ریحان خالد سرگودھا۔ رفیع احمد صدیقی راول پنڈی۔ نادیہ خالد لاہور۔ اسماء جمیل لاہور۔ آصف سلمان کراچی۔ بشریٰ شریف ہارون آباد۔ عرفان احمد لاہور۔ نازیہ بشیر ڈسکہ۔ اشعر علی لاہور۔ نازیہ شیرازی جھنگ۔ عقیل احمد ملک فیصل آباد۔ ثروت وحید بہاول پور۔ احسان اللہ شہاب چیچہ شریف۔ علاء رحمت لاہور۔ محمد عثمان گوجرانوالہ۔ حسیب احمد کملیہ۔ عادل خان ٹوپی۔ عمر عباس بابر پشاور۔ چوہدری محمد احتشام حیدر فیصل آباد۔ حماد اسلم لاہور۔ بشریٰ اجالا رشید اٹک شہر۔ فرقان احمد لاہور۔ شیر نواز گل اورمڑ پیاں۔ محمد عمیر اسلام آباد۔ سمیرا فاروق راول پنڈی۔ بخش بی بی اسلام آباد۔ شہزاد سلطان حافظ آباد۔ سعد حسن بھٹی اسلام آباد۔ محمد فیصل سیال کوٹ۔ عثمان الحق قریشی کلر سیداں۔ عمران احمد مسعود ٹیکسلا۔ شاہد امین گوجرانوالہ۔ اطہر محمود ٹیکسلا چھاؤنی۔ اسامہ امتیاز ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عاصم غفور بہاول پور۔ محمد قاسم گوپانگ ڈیرہ غازی خان۔ ندا حفیظ اسلام آباد۔ سمیرا اعظم خان راول پنڈی۔ احمد علی خان کراچی۔

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 ستمبر 1998ء

دماغ لڑاؤ

نام ______________

مقام ______________

پتا ______________

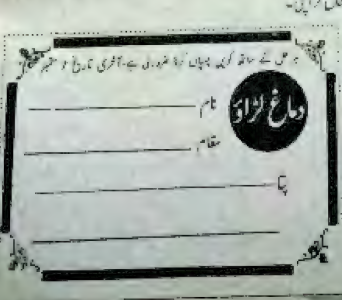

____

اور خزانہ مل گیا

ڈاکٹر رضوان ثاقب

خلیل اس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اس پر ایک دفعہ میں لکھا ہوا تھا "پرانی کہانیوں کی کتاب"۔ کتاب کا نام تھا "خزانے کی تلاش"۔ یہ اس نے اپنے دوست عمران سے لی تھی۔ کتاب میں لکھا تھا کہ بہت عرصہ پہلے مبارز اور اس کا نوجوان ساتھی عرفات خزانے کی تلاش میں مشرقی جنگلات کی طرف نکل گئے تھے مگر اب تک وہاں سے نہیں لوٹے۔ کئی سال گزر گئے ہیں مگر ابھی تک ان کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ لوگ جنگلی حیات اور جانوروں سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے اس لیے انہیں مشرقی جنگلات کے درندے کھا گئے ہیں یا وہ کہیں لاپتا ہو گئے ہیں۔ خلیل ابھی یہاں تک ہی مطالعہ کر پایا تھا کہ کتاب اس کے ہاتھوں سے نیچے جا گری اور وہ نیند کی وادی میں چلا گیا۔

خلیل اور عمران گہرے دوست تھے۔ یہ اتوار کی ایک سہانی صبح تھی خلیل صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکلا تھا ادھر عمران بھی سیر کے لیے اسی باغ میں چلا گیا تھا۔ خلیل نے عمران سے ملتے ہی یہ خواہش ظاہر کی "کیوں نہ ہم دونوں بھی چل کر خزانے کی تلاش میں مشرقی جنگلات کا ایک چکر لگائیں"۔

عمران بولا "ہاں یار! ہمیں یہ ضرور کرنا چاہیے، خزانہ ملے یا نہ ملے، لیکن وہاں شاید مبارز اور عرفات سے ملاقات ہو جائے"۔

چناں چہ ایک دن وہ دونوں تیاری کر کے مشرقی جنگلات کی طرف نکل پڑے۔ طویل اور دشوار گزار راستہ طے کرنے کے بعد وہ اس خوف ناک جنگل میں پہنچے تو وحشی درندوں کی آوازیں سن کر مارے خوف کے ان کی سانسیں رکنے لگیں۔ جس طرف سے خوف ناک آواز آتی، وہ ایک دوسری جانب چلنا شروع کر دیتے۔ وہ سخت پریشان تھے کہ انہوں نے یہاں آنے کا غلط فیصلہ کیوں کر لیا۔ خزانے کی تلاش تو کیا وہ تو اب راستہ بھی بھول چکے تھے۔ یوں ڈرتے ڈرتے وہ چلتے رہے اور جنگل میں بہت دور نکل آئے۔

وحشی جنگل میں پیدل چلتے چلتے سات دن ہو چکے تھے۔ اب تو ان کے پاس موجود خوراک کا ذخیرہ بھی ختم

ہو گیا تھا۔ اب وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بہت پریشان تھے۔ انہیں اب خزانے کی کم اور کھانے کی زیادہ تلاش تھی۔ بھوک سے ان کی جان نکلے جا رہی تھی۔ وہ قحط زدہ لوگوں کی طرح کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔

لقمان آگے آگے چل رہا تھا اور خلیل اس سے چند قدم پیچھے...

لقمان یک دم چلایا "بچاؤ" "بچاؤ"۔

خلیل نے لقمان کی جانب چونک کر دیکھا۔ یہ منظر بڑا خوف ناک تھا۔ ایک سانپ درخت سے لٹک کر لقمان کے گلے کے گرد لپٹ رہا تھا۔ سانپ جیسے زہریلے جانور پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا مگر خلیل نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور آگے بڑھ کر لقمان کے گلے سے سانپ کو پکڑ کر دور پھینک دیا۔ خلیل نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے' اپنے دوست کی جان بچائی۔ وفادار دوست کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ ابھی وہ تھوڑا ہی آگے بڑھنے پائے تھے کہ ایک خون خوار بھیڑیا ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ لقمان تو پہلے ہی سانپ والے واقعے سے بہت خوف زدہ تھا' خون خوار بھیڑیے پر نظر پڑتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر مخالف سمت میں دوڑ لگا دی' لیکن خلیل نے سوچا کہ یہ تو مردوں والی بات نہ ہوئی کہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق سے افضل بنایا ہے ایک بھیڑیے سے ڈر کر بھاگ جائے۔ لہٰذا اس نے اس بھیڑیے سے مقابلے کی ٹھان لی۔ نیفے میں اڑسا ہوا خنجر خلیل اب اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ وہ بھیڑیے کی طرف قدم بڑھانے ہی والا تھا کہ اس کے بڑھنے سے پہلے ہی بھیڑیا اس پر جھپٹ پڑا۔ خلیل نے شکاریات کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں پڑھی تھیں' اس لیے وہ درندوں سے بچنے کے کچھ داؤ پیچ جانتا تھا۔ بھیڑیے کے جھپٹنے کے ساتھ ہی وہ فوراً زمین پر چت لیٹ گیا۔ بھیڑیا اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کی پشت اب خلیل کی جانب تھی۔ خلیل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا اور پورے زور سے خنجر بھیڑیے کی پشت میں گھونپ دیا۔ خنجر کے واپس کھینچنے کے ساتھ ہی خون کا ایک فوارہ اس کی پیٹھ سے نکلا۔ بھیڑیے نے زخمی ہو کر ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔

اس مہم کے سر ہونے پر خلیل نے اللہ کا شکر ادا کیا اور سکون کا سانس لیا۔ اتنی دیر میں لقمان بھی واپس آ چکا تھا۔ وہ بھیڑیے کو مار بھگانے پر خلیل کو خوب داد دے رہا تھا۔ وہ اب مزید آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر بھوک کی وجہ سے بے حد نڈھال ہو چکے تھے۔ بھوک کی شدت کے باعث ان کے لیے ایک قدم آگے بڑھنا بھی محال ہو رہا تھا۔ مگر جب انہوں نے دور ایک جگہ دھواں اٹھتا دیکھا تو ان کی ڈوبتی نبضوں میں پھر سے جان آنے لگی۔ دونوں گرتے پڑتے اس دھوئیں کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ کسی محفوظ جگہ نہ پہنچ سکے تو بھوک کی وجہ سے یہیں ڈھیر ہو جائیں گے اور کسی کو ان کی خبر بھی نہ ہو گی۔ پھر ان کی لاشیں یہیں پڑی پڑی گل سڑ جائیں گی۔

گرتے پڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے وہ اب دھوئیں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں انہیں ایک جھونپڑی نظر آئی جس کے آگے دروازے کی جگہ لکڑی کا ایک پٹ لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر انہوں نے آواز دی... مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر انہوں نے جھونپڑی پر لگے ہوئے لکڑی کے اس پٹ کو پیٹنا شروع کیا' مگر اندر اب بھی کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہ آئے۔ جب دوسری دفعہ بھی پٹ کو پیٹنے کے باوجود کسی قسم کا جواب نہ ملا تو خلیل نے لکڑی کے پٹ کو پیچھے ہٹایا اور دونوں جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی ان کی نظر ایک بزرگ پر پڑی جو عبادت میں مصروف تھے۔ لقمان اور خلیل کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان بزرگ سے سب سے پہلے یہ سوال کرتے کہ وہ اس خوف ناک جنگل میں کیسے اور کیوں پہنچے' مگر وہ یہ سوال بھلا کیونکر کرتے۔ انہیں تو اپنے پیٹ کی فکر لاحق تھی۔

وہ تو بہت بے تابی سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب یہ بزرگ ان کی طرف متوجہ ہوں اور وہ یہاں آنے کا مقصد بیان کریں۔

جب بزرگ عبادت سے فارغ ہوئے اور سر اوپر اٹھایا تو ان کی نظر خلیل اور لقمان پر پڑی۔ بزرگ نے انھیں بستر کے طور پر رکھی ہوئی گھاس پھونس پر بیٹھنے کو کہا۔ اچانک وہ بزرگ آبدیدہ ہو گئے۔ وہ دونوں جوانوں کو غور سے دیکھتے چلے جا رہے تھے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ پھر انھوں نے ان دونوں کو یہ بتا کر حیران کر دیا۔

"بیٹا! آج پورے پچاس سال بعد کسی انسان کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ میری تو یہ دعا تھی کہ اس خوف ناک اور مگرمچھ کے پیٹ کی طرح گھپ اور بیابان جنگل میں میرے بعد کوئی بھی نہ پہنچے۔ مگر تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

لقمان بزرگ کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے یک دم بول پڑا "بابا جی! ہمیں بھوک لگی ہے، خدارا پہلے ہمیں کھانے کو کچھ دیں۔"

وہ بزرگ اٹھے اور درختوں کی شاخوں سے بنی ہوئی ٹوکری میں سے کچھ پھل نکال لائے۔ وہ ان پھلوں پر جھپٹے اور آن کی آن میں سارے پھل چٹ کر گئے۔ پیٹ کا جہنم بھر گیا تو انھوں نے بزرگ کو بتایا کہ وہ یہاں تک خزانے کی تلاش میں پہنچے ہیں۔ پھر راستہ بھٹک جانے، سانپ اور بھیڑیے سے ڈھیر ہو جانے سمیت سارے واقعات بغیر فل اسٹاپ کے ان کو فرفر سنا دیے۔

بزرگ نے ان کی ساری باتیں غور سے سنیں اور کہا "رات ہونے والی ہے، تم دونوں آرام سے رات گزارو۔ صبح ہم تینوں مل کر خزانے کی تلاش میں نکلیں گے۔"

صبح ہوئی تو وہ تینوں نماز فجر ادا کرتے ہی خزانے کی تلاش میں نکل پڑے۔ راستے میں لقمان کہنے لگا کہ اس نے کتاب میں پڑھا تھا کہ خزانہ جنگل کے قریب مغرب میں سب سے پرانے درخت کے قریب دفن ہے۔ لقمان کی یہ بات سنتے ہی وہ بزرگ چونک پڑے "ارے ارے۔۔۔ یہ کہیں وہی خزانہ تو نہیں جس کی تلاش میں آج سے پچاس سال پہلے میں اور میرے استاد صاحب نکلے تھے"۔

"مگر بابا جی! آپ کو کس نے بتایا تھا کہ یہاں خزانہ ہے؟"

"بیٹا! میں اس وقت تمھاری ہی عمر کا تھا، جب اسکول

سے واپس آکر کہانیوں کی مختلف کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن میں کہانیوں کی ایک کتاب دکان سے خرید لایا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کتاب پر لکھا ہوا تھا "سچی کہانیوں کی کتاب" اور کتاب کی پہلی کہانی تھی "خزانے کی تلاش"۔ میں نے وہ کہانی پڑھی تو اس میں لکھا تھا کہ آج سے چند سال پہلے ایک استاد اپنے شاگرد کے ساتھ خزانے کی تلاش میں مشرقی جنگلات کی طرف نکلے، مگر ابھی تک واپس نہیں لوٹے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جنگلی حیات اور شکاریات کے فن سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے جنگلی درندوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ خوش قسمتی سے میں شکاریات کا ہی طالب علم تھا، لہٰذا میں نے سوچا، کیوں نہ میں بھی اپنے استاد صاحب کو رضا مند کر کے ساتھ لے چلوں اور جنگل میں جا کر خزانہ تلاش کروں۔ میرے استاد محترم اس مہم ہوئی کے لیے رضا مند ہو گئے۔ اس طرح ہم دونوں یعنی میں اور میرے استاد صاحب جنگل میں پہنچ گئے، مگر باوجود کوشش کے ہم جنگل سے باہر نہ نکل سکے۔ ہم راستہ بھول گئے... غذا کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ لمبا سفر کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ میرے استاد محترم کئی سال زندہ رہنے کے بعد سردیوں کی ایک رات سردی کی شدت برداشت نہ کر سکے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس دن سے میں اکیلا یہاں رہ رہا ہوں۔ مجھے نہ تو ابھی تک خزانہ ملا ہے اور نہ ہی گھر کا راستہ۔

"بابا جی! ایسی کہانی میں نے بھی پڑھی تھی اور پھر ہم دونوں جنگل کی طرف نکل آئے تھے۔ شاید یہ سب کہانیاں صدیوں پرانی ہیں، مگر پھر بھی لکھنے والا اسے "چند سال پہلے کا ذکر ہے" کہ کر لکھتا ہے۔ کیا ہمیں اب خزانہ نہیں ملے گا؟" لقمان نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

"نہیں بیٹا! ایسی بات نہیں... دراصل کہانی تو ہمیں سمجھانے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ وہ فرضی بھی ہو سکتی ہے اور حقیقی بھی۔ اسی کہانی کو ہی لے لیجیے جسے میں نے اور آپ نے بھی پڑھا۔ اس میں مصنف یہ بتانا چاہتا تھا کہ جو لوگ علم کی دولت سے مالا مال ہونے کے بجائے علم کے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے خزانے کی تلاش میں جنگلوں کی طرف نکل جاتے ہیں، انہیں کبھی خزانہ نہیں ملتا، بلکہ وہ علم جیسی لازوال دولت اور دنیا کی تمام تر نعمتوں اور رنگینیوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور اکیلے رہ جاتے ہیں"۔

"بابا جی! سچ؟" خلیل نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا سچ، بلکہ میری کہانی سننے کے بعد تو آپ کو کہنا چاہیے کہ بالکل سچ"

"بابا جی! چلیں پھر خزانے کی تلاش چھوڑ کر اپنے گھر کا راستہ تلاش کریں اور جا کر علم کے خزانے سے اپنے دامن کو بھریں" خلیل اور لقمان نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"شاباش بیٹا! آؤ میں بھی اب تمہارے ساتھ اسکول جایا کروں گا"۔

وہ دونوں بزرگ کی یہ بات سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ "کیا بھلا کوئی بابا بھی اسکول جاتا ہے" لقمان نے کہا۔

پھر وہ تینوں خزانے کی تلاش چھوڑ کر گھر کی طرف جا رہے تھے، علم کا خزانہ حاصل کرنے کے لیے۔ "خلیل الرحمان! بیٹا جلدی سے اٹھ جاؤ۔ صبح ہو گئی ہے۔ دیکھو تمہاری کتاب نیچے گری ہوئی ہے۔ اسے جلدی سے اٹھاؤ۔ اچھے بچے اپنی کتابوں کو نیچے نہیں گرنے دیا کرتے۔ وہ علم کی قدر کرتے ہیں۔ علم بہت بڑا خزانہ ہے اور یہ اچھی اچھی کتابوں میں ہی پوشیدہ ہے"۔ خلیل کے کانوں میں اس کی امی کی آواز پڑی تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی کہانیوں والی کتاب جسے وہ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی ساری رات ایک طویل خواب دیکھتے ہوئے گزر گئی تھی۔ مگر اس خواب نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا تھا۔

"کیا یہ خواب تھا؟ مگر لوگوں کو تو جاگتے میں بھی اتنا بڑا خزانہ نہیں ملا، میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے سوتے میں خزانہ مل گیا۔ وہ بھی سب خزانوں سے عظیم تر... علم کا خزانہ" اس نے مسکرا کر کہا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔

آپ کا خط ملا

مجھے مضامین کہانیوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں اس لیے آپ مضامین زیادہ دیا کریں۔ اس دفعہ رستم کی موت اور رنگ باستان بہت پسند آئے۔ رسالے کی قیمت بڑھا کر صفحات بڑھا دیں (علی نواز خان لودی)

چار شہزادوں نے رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ دھوپ چھاؤں کی دوسری قسط بھی اچھی تھی (معظم آفتاب، کوٹ)

میں ایک لطیفہ ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ پسند کریں گے۔ صفحات بڑھا دیں۔ آپ بھی کھیلوں میں حصہ لینے والوں کو سرٹیفکیٹ دیے جائیں … شروع کیا جائے (اسرار احمد شیخ …)

اس دفعہ شمارہ اچھا تھا۔ مگر سرورق اگست کے لحاظ سے نہ تھا۔ … کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں (… چوہان)

اگست کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیوں میں … 'چار شہزادے' اور … پسند آئیں (… افضل …)

… پسند آیا۔ کہانیوں میں نورالی کی آپ بیتی 'چار شہزادے' اور … پسند آئیں۔ کھیلوں کی دنیا بہت پسند آیا (عبداللہ … نہیں لکھا)

جون کا تعلیم و تربیت بے حد پسند آیا۔ سبھی کہانیاں اچھی تھیں مگر رستم کی موت، … 'چار شہزادے' اور … نظموں میں … کی نظم … (… اشرف …)

اگست کے شمارے کا سرورق … رسالے کی کہانیاں … شروع … میں رستم کی موت، چار شہزادے … دھوپ چھاؤں … اچھی تھیں … (…)

اگست کا تعلیم و تربیت اپنی خوبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ کہانیاں تقریباً سب ہی اچھی تھیں۔ خاص طور پر 'چار شہزادے' اس کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ نورالی کی آپ بیتی بھی پسند آئی۔ دھوپ چھاؤں کی تیسری قسط بھی بہت زبردست تھی۔ … کے متعلق مضمون پڑھ کر اس کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوئیں (ثمرین لطیف، لاہور)

اس دفعہ کا رسالہ نہایت شاندار تھا۔ سائنس فکشن پڑھ کر بہت مزا آیا۔ کہانیوں میں نورالی کی آپ بیتی (تیسری قسط) 'چار شہزادے' اپنا جواب آپ تھی … بہت پسند آئیں (سعید اللہ خان، گوجرانوالہ)

اگست کا شمارہ بہت پسند آیا۔ چار شہزادے خوب رہی۔ اب دو شہزادوں کی آپ بیتی کا بے چینی سے انتظار ہے (حنا عروج … حیات خان)

تعلیم و تربیت اپنی مثال آپ تھا۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں رستم کی موت، قسطوں کی … سب سے بہترین تھیں (سرفراز اقبال … کوٹ)

اس ماہ کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں ہاکی کے متعلق مضمون بھی شائع کریں (ملک خرم شہزاد اعوان، سرگودھا)

تعلیم و تربیت پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ لیکن … ہمیں منہ چڑھا رہا تھا (شیخ محمد انس، فیصل آباد)

تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ کھیلوں کی دنیا میں سعید انور کا انٹرویو شائع کریں (محمد ساجد حسین، میانوالی)

آپ کھیلوں کی دنیا میں نئے کھیل بھی متعارف کرائیں جن سے ہم اور ہمارے دوسرے ساتھی بے خبر ہیں۔ اس سے یقیناً ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا (…)

آپ سے بھرپور التجا ہے کہ بزم کوئز کا سلسلہ شروع کر دیں۔ تقریباً سب ساتھیوں کی رائے یہی ہے (محمد حسان طارق، ساہیوال)

اگر آپ کو سب ساتھی کہتے ہیں کہ بزم کوئز شروع کریں تو آپ شروع کیوں نہیں کرتے۔ … جیسے سلسلوں کی تاریخ … (…)

رسالے کے پہلے صفحے پر 1940ء سے … لکھا ہوتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا تعلیم و تربیت پاکستان بننے سے پہلے سے شائع ہو رہا ہے؟ (… احمد، لاہور)

جی ہاں! آپ کا محبوب رسالہ … ہے۔

ماہ اگست کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ اس کے علاوہ کہانیوں میں رستم کی موت، … اور … پسند آئیں اور چار شہزادے … تھی۔ اس کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے

(سیدہ طیف، فیصل آباد)

سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ کہانیاں سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص طور پر چار شہزادے، ہنورانی کی آپ بیتی اور فساد کی جڑ پسند آئیں۔ نظمیں اور لطائف بھی زبردست تھے (فہد اکرم، فیصل آباد)

کہانیوں میں رستم کی موت، غار کا بچہ، چار شہزادے، آدھا جانور آدھا انسان، فساد کی جڑ اچھی تھیں۔ آپ سائنس کے کھیل اور مجرم کون کا سلسلہ بھی شروع کریں (حسیب احمد، کمالیہ)

اگست کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ نیاز علی بھٹی کی تحریر چار شہزادے پڑھ کر بہت مزا آیا اور اب دو شہزادوں کی آپ بیتی سننے کے لیے پورا ایک مہینا انتظار کرنا پڑے گا اف خدایا! ایٹم بم کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا (طیبہ رفیق، لیاقت پور)

غار کا بچہ، رستم کی موت، آدھا جانور آدھا انسان اور چار شہزادے بے حد پسند آئیں۔ اس کے علاوہ نظمیں بھی بہت اچھی تھیں۔ ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ مضمون ایٹم بم بہت معلوماتی تھا (عاصمہ آصف، ٹیکسلا)

سلسلے وار ناول دھوپ چھاؤں اور فساد کی جڑ، ایٹم بم اور غار کا بچہ ہمیں بہت پسند آئیں۔ اس ماہ ابن الطاف نے کھیلوں کی دنیا میں فتح کا نشان لکھ کر تمام شائقین کرکٹ کے دل موہ لیے۔ آپ ہر ماہ کرکٹ کے کھلاڑیوں کے کارناموں کے متعلق ضرور لکھا کریں (ماجد رشید، لاہور چھاؤنی)

غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ اگست کے شمارے کا سرورق جشن آزادی سے ہٹ کر تھا۔ بہرحال شان دار ضرور تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب کا مضمون ایٹم بم اور دلچسپ اور ناقابل یقین بہت پسند آئے (تسنیم تنویر، توقیرت برادری)

سرورق مہینے کے مطابق تھا۔ کہانیوں میں رستم کی موت، فساد کی جڑ اور انعام اور سزا پسند آئیں۔ ناول (دھوپ چھاؤں) ٹھیک جا رہا ہے۔ مضمون ایٹم بم پسند آیا۔ کھیلوں کی دنیا میں مضمون فتح کا نشان زبردست تھا۔ اگر تعلیم و تربیت پندرہ روزہ ہو جائے تو کیا بات ہے (شعیب احمد ہاشمی، حسن ابدال)

اس ماہ کا سرورق نہایت ہی شان دار تھا۔ نظمیں بھی بہت اچھی تھیں۔ کہانیوں میں رستم کی موت، سزا اور انعام، غار کا بچہ، ہنورانی کی آپ بیتی اور دھوپ چھاؤں پسند آئیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر رضوان ثاقب کے مضمون ایٹم بم سے کافی معلومات حاصل ہوئیں (سید شفیق عالم شاہ، ٹھٹھہ)

سرورق پر مچھلیوں اور مینڈک کو برسات مناتے دیکھ کر مزا آگیا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ نظم بارش کا موسم بہت اچھی تھی (ثمرہ طاہر، بکھر)

ساون کے مہینے کے اعتبار سے ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں بچی کہانی غار کا بچہ اور چار شہزادے اچھی تھیں۔ دھوپ چھاؤں ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ آدھا جانور اور آدھا انسان بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب کا مضمون ایٹم بم بہت معلوماتی تھا (محمد ایاز بھٹی، چک گلگ)

سرورق انتہائی دل کش تھا۔ جی چاہتا ہے کہ ایسا منظر بھی حقیقت میں دیکھیں۔ کہانیوں میں رستم کی موت، غار کا بچہ، چار شہزادے اور فساد کی جڑ پسند آئیں۔ انکل اسائنس فکشن کی تصویر تبدیل کر دیں (راشدہ کرن، لاہور)

اس دفعہ کا ٹائٹل یوم آزادی کی مناسبت سے ہونا چاہیے تھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس دفعہ تو مینڈک اور مچھلیاں بھی ہمارے ساتھ آزادی کی خوشیاں منا رہے ہیں۔ ہنورانی کی آپ بیتی پڑھ کر تحریک آزادی کے واقعات آنکھوں میں گھوم گئے۔ عبدالستار خان طاہر کا سلسلہ دلچسپ اور ناقابل یقین نہایت معلومات افزا ہے (شاہد علی، نارووال)

سرورق خاص نہ تھا۔ کہانیاں اور نظمیں تمام اچھی لگیں۔ جاوید میانوالوی کا مضمون بہت اچھا لگا (محمد طاہر عمران، ڈیرہ اسماعیل خان)

تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ خاص طور پر رستم کی موت، سزا اور انعام، فساد کی جڑ اور آدھا جانور آدھا انسان بہت اچھی لگیں۔ محترم حکیم حمیدی اگرچہ ہمارے درمیان موجود نہیں مگر ان کی یادیں ان کی شاعری کی صورت میں ہمارے ساتھ ہیں (قاضی محمد سلمان، ڈیرہ غازی خان)

اگست کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ ٹائٹل پر ہاتھ کے بجائے کسی اچھے فوٹوگرافر کی بنائی ہوئی تصویر دیا کریں (سید معظم حسین، لاہور)

ٹائٹل کچھ خاص نہ تھا البتہ کہانیوں نے اس کی کمی پوری کر دی۔ کہانیوں میں نجمہ معراج کی سزا اور انعام اور نیاز بھٹی کی چار شہزادے بہت پسند آئیں۔ لطائف پڑھ کر ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ سلسلہ وار ناول دھوپ چھاؤں بھی اچھا ہے۔ ڈاکٹر رضوان ثاقب سے گزارش ہے کہ وہ مجاہدین آزادی میں سرسید احمد خان پر مضمون لکھیں۔ ابن الطاف کے مضمون کھیلوں کی دنیا میں فتح کا نشان پڑھ کر دل خوش ہو گیا (محمد کمیر ارشاد، جھنگ)

ہر تحریر کا انتخاب قابل تحسین تھا۔ رستم کی موت ایک پرانی اسلامی کہانی تھی۔ دیگر تحریروں میں غار کا بچہ، چار شہزادے، فساد کی جڑ اور ایٹم بم بہترین تھیں (عدیل دانش، کراچی)

اس مرتبہ کہانیوں میں آدھا جانور آدھا انسان اور رستم کی موت پسند آئیں۔ آپ مجرم کون کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں نیز کھیلوں کی دنیا میں شاہد آفریدی کے بارے میں معلومات شائع کریں (سلمان رشید، گوجرانوالہ)

ٹائٹل برسات کے خوشنما مناظر کو اجاگر کر رہا تھا۔ رستم کی موت نے ہمیں مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت کی یاد دلائی۔ نجمہ معراج کی کہانی سزا اور انعام اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھی۔ ایک چھوٹی سی بات کو پھیلا کر

ایک طویل ناول رسالے سے ... سے ان کی رائے کہ کب اسکول ہو
ملک فیصل آباد)

اگست کا شمارہ ہر ماہ کی طرح بہترین تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ سلسلہ وار ناول صوب چھلاوہ کی تیسری قسط بہترین تھی۔ کھلاڑیوں کی دنیا میں ... کو بھی شامل کریں (... ملتان)

... بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں رستم کی موت، ننھا راہی کی آپ بیتی اور فسانہ کی ... پسند آئیں ... مضمون بہت پسند آیا (فرید احمد فاروق غوری ...)

آپ بھی لکھیے میں ... شیر احمد ... کی کہانی ... نقل شدہ ہے۔ ثبوت کے لیے ... رسالہ ارسال کر رہا ہوں (عابد علی ... رحمت اللہ ...)

... کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔ آئندہ ان کی کوئی تحریر تعلیم و تربیت میں شائع نہیں ہوگی۔ (ادارہ)

آپ بھی لکھیے میں ... کی کہانی ... نقل شدہ ہے۔ ثبوت کے لیے ... رسالہ ... لطیف ... ارسال ... (... فیصل آباد ...)

... کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔ آئندہ ان کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوگی۔ (ادارہ)

مجھے تعلیم و تربیت ... بہت پسند ہے ... کہانیاں اچھی تھیں ... بہت ... (...)

سرورق ... دل خوش ہو گیا ... کھلاڑیوں کی دنیا کا سلسلہ بھی بہت ... (... شائع ... بہاولپور ...)

اگست کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں ... آپ بیتی، رستم کی موت، فسانہ کی ... اور ... بہت پسند آئے ... کھلاڑیوں کی دنیا ... (...)

سرورق بہت پسند آیا۔ سزا اور انعام، ننھا راہی کی آپ بیتی اور ... اچھی لگیں ... (...)

کیر تھا)

سرورق ... دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانی رستم کی موت اچھی تھی۔ سزا اور انعام بھی ٹھیک رہی۔ ڈاکٹر ... کا مضمون ... بہت خوب رہا (محمد اکرم ... ملتان)

کہانیوں نے دل موہ لیا۔ رستم کی موت، فسانہ کی ... اور سزا اور انعام بہت اچھی تھیں۔ صوب چھلاوہ کا سلسلہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ مجرم کون؟ کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں (... انجم ...)

رستم کی موت اور غار کا بچہ بہت اچھی کہانیاں تھیں جب کہ ... مضمون معلومات میں اضافہ کر گیا (ثاقب ...)

سرورق پر تیرتی ہوئی خوبصورت مچھلیاں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں اچھی تھیں (قرۃ العین ... ملتان)

برسات کے حوالے سے ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں دلچسپ تھیں۔ میری سب سے پسندیدہ سلسلہ دلچسپ اور ... ہیں (... شہزاد پشاور)

سزا اور انعام اچھی کہانی تھی۔ غار کا بچہ بھی اپنی مثال آپ تھی بلکہ سارا رسالہ ہی بہت اچھا تھا۔ چٹ پٹے مسالے دار ... اور مجرم کون؟ کے سلسلے دوبارہ شروع کریں (... گوجرانوالہ)

تعلیم و تربیت ایک صاف ستھرا ماہنامہ ہے جس میں ایک طالب علم کی دلچسپی کا تمام تر مواد ہوتا ہے۔ یقیناً اس دور میں اس جیسا معیاری رسالہ نکال کر آپ قیمتی خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ... اس ماہ کے رسالے میں ... کہانی رستم کی موت بہت پسند آئی۔ ... ایک معلوماتی مضمون ہے ... بہت ... اور معلوماتی ... فسانہ کی ... بھی پسند آئی ...

... بہت خوب تھیں ... بہت اچھا جا رہا ہے۔ کھلاڑیوں کی دنیا بھی خوب ... (...)

... سب کہانیاں، مضامین اور نظمیں اچھی اور معیاری تھیں۔ سب سے ... بہت ... (...)

سرورق ... ایک ... صاحب کا ناول صوب چھلاوہ ... (...)

... کھلاڑیوں کی دنیا ... اور ... کے سلسلے میں معلومات بہت اچھی تھیں (... فیصل آباد)

اگست کا سرورق بہت زبردست تھا۔ خاص طور پر غار کا بچہ، ... خوب ہے ... فسانہ کی ... بہت اچھی تھیں (محمد عبداللہ ...)

مصنف: ڈاکٹر انجم رحمانی

مصور: محمود حسین رومی

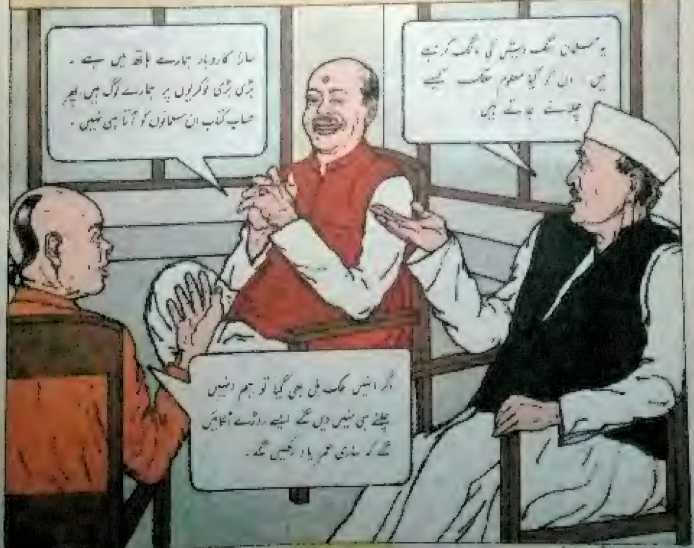

قرارداد لاہور 1940ء کے دوران میں میاں بشیر احمد نے اپنی مشہور نظم قائد اعظم کے حضور پیش کی

محمد علی جناح

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

صد شکر ہے پھر گرمِ سفر اپنا کارواں
اور میرِ کارواں ہے محمد علی جناح

بیدار مغز ناظمِ اسلامیانِ ہند
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

تصویرِ عزم، جانِ وفا، رُوحِ حریت
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

رکھتا ہے دل میں تابِ تواں نو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناح

رگ رگ میں اس کی ولولہ ہے حبِ قوم کا
پیری میں بھی جواں ہے محمد علی جناح

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناح

اے قوم اپنے قائدِ اعظم کی قدر کر
اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

عمرِ دراز پائے مسلماں کی ہے دُعا
ملت کا ترجماں ہے محمد علی جناح

آپ بھی لکھیے

کوئل

رضوان ربانی' لاہور

آپ نے کوئل تو دیکھی ہو گی اور اس کی آواز بھی سنی ہو گی۔ آپ نے اس کی آواز کو کبھی غور سے سنا ہے۔ اگر کبھی اتفاق ہو تو اس کی کوک ضرور سننا۔ اس کی آواز میں بڑی اداسی ہوتی ہے۔ اور یہ اپنا گھونسلا بھی نہیں بناتی۔ دوسرے پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے دیتی ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی گاؤں میں ایک بہت ہی غریب عورت اپنے بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ سارا دن گھر کا کام کاج کرتی اور محنت مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتی اور سب بچوں کو اسکول بھی بھیجتی تھی۔ ایک مرتبہ یہ غریب عورت کنوئیں سے کپڑے دھو کر گھر واپس آئی تو سردی سے کانپ رہی تھی۔ بچے گھر میں انگیٹھی کے پاس بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ ماں نے ان سے کہا "بیٹا ذرا سی جگہ مجھے بھی دے دو ورنہ میں بیمار ہو جاؤں گی۔ میرے چاند ذرا پرے کھسک جاؤ میں بھی آگ تاپ لوں۔ کیوں کہ میرے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔

بڑا لڑکا برا سا منہ بنا کر بولا "میرے جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اسکول سے آتے وقت بارش سے سارے پیر بھیگ گئے تھے' میں انہیں گرم کر رہا ہوں اس لیے میں انگیٹھی سے ہرگز ہرگز پرے نہیں ہٹ سکتا"۔

دوسرے نے کہا "میری ٹوپی پھٹی ہوئی ہے۔ جب ہم اسکول سے آرہے تھے تو بارش ہونے لگی۔ میرا سارا سر بھیگ گیا ہے لو ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔ میں یہ سکھا رہا ہوں اس لیے ہرگز ہرگز پرے نہیں ہٹ سکتا"۔

بچی بولی "ہائے امی مجھے تو یہاں بڑا مزا آرہا ہے۔ میں یہاں سے ہرگز نہیں اٹھ سکتی"۔

بے چاری ماں چپ چاپ باورچی خانے میں گئی اور آٹا گوندھنے لگی۔ آٹا گوندھ لیا تو اس نے روٹی پکائی اور بچوں کو کھلا دی۔ پھر بستر پر لیٹ گئی۔ مگر اسے نیند نہ آئی۔ درد سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ سارا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ صبح جب بچے سو کر اٹھے تو ماں ابھی تک بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ رات کی بچی ہوئی روٹی کھا کر اسکول چلے گئے۔ چھوٹا بچہ گھر میں رہ گیا۔ وہ اسکول نہیں جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ دن ڈھل گیا۔ سہ پہر ہو گئی۔ ماں بھوکی پیاسی بستر پر پڑی کراہ رہی تھی۔ بچے اسکول سے واپس آئے تو بولے "ارے امی روٹی نہیں پکائی"۔

ماں بولی "بیٹا" میں بیمار ہوں۔ ہلا تک نہیں جاتا' تم روٹی کو کہہ رہے ہو گھر میں پانی تک نہیں۔ جاؤ کنوئیں سے پانی بھر لاؤ"۔

بڑا لڑکا بولا "ماں میں نے بتایا تھا کہ میرے جوتے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جا سکتا"۔

دوسرے نے کہا "میری ٹوپی پھٹی ہوئی ہے میں نہیں جا سکتا"۔

لڑکی بولی "میں نے اسکول کا کام کرنا ہے میں نہیں جا

تھی"۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماں کو پیاس لگی تھی اور گھر میں پانی کی ایک بوند تک نہ تھی۔ ماں نے رو کر کہا "کاش میں پرندہ بن جاؤں اور ان برے بچوں سے دور چلی جاؤں۔ میں ان کے لیے صبح سے شام تک اپنی جان ہلکان کرتی ہوں اور یہ مجھے پانی تک نہیں پلا سکتے"۔

پھر اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ بچوں کی ماں کوئل بن گئی۔ چھوٹا بچہ دوڑا دوڑا آیا اور اپنے بہن بھائیوں سے کہنے لگا "جلدی آؤ ہماری ماں کوئل بن گئی ہے" پھر دوڑا ہوا ماں کے پاس آیا اور کہنے لگا "ماں ماں تم کہاں جا رہی ہو؟"

کوئل نے جواب دیا "میں دور جا رہی ہوں۔ اب میں تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گی"۔

بچوں نے کہا "امی واپس آجاؤ۔ ہم تمہارے لیے پانی لاتے ہیں"۔

کوئل نے کہا "میں پرندہ بن گئی ہوں۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں اب جنگلوں میں رہوں گی اور چشموں کا پانی پیوں گی" یہ کہہ کر وہ اڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ آخر کوئل اڑتے اڑتے تھک کے ایک درخت پر بیٹھ گئی۔ دوسرے دن سورج نکلا تو کوئل نے پر کھولے اور ایسی اڑی کہ پھر نظر نہ آئی۔ اس کا دل بچوں سے بھر چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کہیں گھونسلا بنائے۔ وہ ساری زندگی ادھر ادھر گھومتی رہی۔ اب کوئل یہی کرتی ہے کہ کسی درخت پر بیٹھ کر رونے لگتی ہے۔ وہ اپنا گھونسلا نہیں بناتی بلکہ کسی دوسرے پرندے کے گھونسلے میں انڈے دیتی ہے اور ہمیشہ اداس رہتی ہے اور اسی اداسی میں اکثر کوکتی رہتی ہے (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

پاک فضائیہ زندہ باد!

مسعود بشیر احمد، گوجرانوالہ

9 ستمبر 1965ء کی جنگ کا چوتھا دن تھا۔ ان چار دنوں میں ہم طیاروں کی گھن گرج کے خوب عادی ہو چکے تھے۔ بھارتی جیٹ بم بار بار بار آتے، قصبے کے گرد پرواز کرتے اور عجلت میں بھاگ جاتے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ انھوں نے بم گرانے کی جرات کی ہو۔ کیوں کہ پاک فضائیہ کے لڑاکا طیارے انھیں آڑے ہاتھوں لینے کے لیے پہلے سے موجود ہوتے۔

اس دن میں اپنے ایک دوست کو لینے ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ گیارہ بجنے کو تھے اور ریل گاڑی ابھی نہیں پہنچی تھی۔ میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی طرف ہو لیا۔ کیوں کہ وہاں ریڈیو سنا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگ ریل گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جب کہ کچھ ریڈیو پر خبریں سننے کے منتظر تھے۔

آخر کار خبریں نشر ہونے کا وقت آگیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے ریڈیو کی آواز کچھ تیز کر دی۔ نہایت ولولہ انگیز خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پاک فضائیہ کے جیٹ طیاروں نے اس صبح دشمن کے پٹھان کوٹ کے قریب بم بار طیارے مار گرائے تھے۔

اسی اثنا میں ریل گاڑی بھی آن پہنچی۔ اس گاڑی میں میرا دوست بھی تھا۔ میں نے اپنے دوست کو خوش آمدید کہا اور اسے تازہ ترین خبروں سے آگاہ کیا۔ جونہی ہم اسٹیشن سے باہر نکلے، طیاروں کی گرج دار آوازیں سنائی دیں۔ ہم نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مشرق کی جانب سے چار ہوائی جہاز آسمان پر نمودار ہو چکے تھے۔

"بھارتی بم بار!" میں نے اپنے دوست کو بتایا۔

ان میں سے دو نے نیچے کی طرف غوطہ لگایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بم آزاد کرتے، مغرب کی جانب سے دو اور لڑاکا طیارے گرجتے ہوئے آ گئے۔ فضا مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ بعد میں آنے والے لڑاکا طیارے پاک فضائیہ کے سیبر تھے۔ یہ طیارے غوطے لگاتے، اوپر اٹھتے اور دائیں بائیں لڑتے ہوئے ایک دوسرے کا تعاقب

کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے بے اختیار مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آیا۔

پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

بھارتی طیاروں کی بلندی کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی۔ پاک فضائیہ کے شاہین صفت طیاروں نے ان کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک شاہین بھارتی طیاروں کا کچھ اس انداز سے پیچھا کر رہا تھا جیسے وہ ان کی دموں سے چپکا ہوا ہو۔

"تڑ تڑ تڑا!" اس آواز کے سنائی دیتے ہی بھارتی طیاروں میں سے ایک کے پرخچے اڑ گئے۔ دوسرا بھارتی طیارہ یکایک مڑا اور مشرق کی جانب ہو لیا۔ لیکن ایک سیبر کسی ماہر شکاری کی طرح اس کا پیچھا کرنے لگا۔

کچھ ہی لمحوں بعد یہ بھارتی طیارہ بھی شعلوں میں لپٹا ہوا دکھائی دیا اور زور دار دھماکے سے زمین سے جا ٹکرایا۔ اس دوران میں باقی دونوں بھارتی بم بار فرار ہو گئے۔

آسمان اب پہلے کی طرح خاموش اور پرسکون تھا۔ البتہ دھوئیں کے بادل پاک فضائیہ کے شاہینوں کی بہادری اور بے باکی کی داستان سنا رہے تھے۔

"پاک فضائیہ! زندہ باد..... پاکستان!۔ پائندہ باد"

ان نعروں نے ہمیں احساس دلایا کہ ہم یہاں تنہا نہیں کھڑے بلکہ بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو چکا ہے۔ چناں چہ ہم بھی زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے قصبے کی طرف روانہ ہو گئے (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

شرارت کا انجام

نوید حفیظہ، رینالہ خورد

یہ گرمیوں کی چھٹیوں کی بات ہے۔ دن بارہ چھٹیاں ویسے ہی گزر گئیں۔ ہم بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگے۔ اس دن امی جان خالہ کے گھر گئیں ہوئی تھیں اور ابو کام سے دوسرے شہر گئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ آج موقع اچھا ہے۔ کیوں نہ کوئی شرارت کی جائے۔ لیکن باوجود کوشش کے بھی ہمارے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آئی۔

آخرکار میں اور میری دوست حمیرا دماغ جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ میری دوست حمیرا بہت چالاک تھی۔ اس نے جلد ہی ایک ترکیب سوچ لی۔ ہمارے گھر میں انگوروں کی ایک بیل لگی ہوئی تھی۔ انگور کھٹے ہونے کی وجہ سے امی توڑنے نہیں دیتی تھیں۔ حمیرا نے ہمیں اپنا پلان بتاتے ہوئے کہا "کیوں نہ آج چوری چھپے انگور توڑے جائیں۔ آج تو آپا بھی سوئی ہوئی ہیں اور چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی بہلا پھسلا کر سلا دیتے ہیں اور پھر اپنے منصوبہ پر عمل کرتے ہیں"۔

ہمیں ڈر تھا کہ چھوٹے بہن بھائی امی کو بتا دیں گے۔ اس لیے ہم نے اپنی ترکیب کو عمل جامہ پہنانے سے پہلے سب بچوں کو بلا کر ان سے کہا کہ جو پہلے سوئے گا اس کو ہم ٹافیاں دیں گے۔

لالچ میں سبھی بچے لیٹ گئے۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سب سو بھی گئے۔ اب ہم نے دیوار پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی ہم تھوڑا اوپر ہی گئے تھے کہ اچانک کھڑکا ہوا۔ کھڑکا سن کر ہم فوراً نیچے اتر آئے۔ جا کے دیکھا تو بلی نے باورچی خانے میں کھڑکا کیا تھا۔ غصے سے ہمارا پارہ چڑھ گیا اور دوپہر ہونے کی وجہ سے ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ ابھی ہم نے بلی کو مارنا ہی چاہا تھا کہ وہ ہماری ٹانگوں میں سے گزر گئی۔

اب ہم نے دوبارہ چڑھنا شروع کیا۔ اوپر جا کر ہم اپنے آپ کو بہت بہادر اور طاقت ور سمجھنے لگے۔ اب ہم نے اپنی دوست حمیرا سے کہا کہ ہم انگور توڑتے ہیں اور تم پکڑتی جاؤ۔ ابھی ہم نے پہلے گچھے کی طرف ہی ہاتھ بڑھایا تھا کہ ہم پر بھڑوں کا حملہ ہو گیا۔ بھڑیں اتنی زیادہ تھیں کہ ہمارے سارے جسم سے چمٹ گئیں۔ ہم نے چیخنا شروع کر

رہا۔ درد کی وجہ سے ہمارا پاؤں دیوار سے پھسلا اور ہم سیدھے غسل خانے کے گٹر میں جا گرے۔

چیخوں کی آواز سے بچے بھی اٹھ کر آگئے۔ انہوں نے ہمیں ادھر ادھر دیکھا لیکن ہم کہیں ہوتے تو نظر آتے۔ اچانک نائلہ کی نظر غسل خانے پر پڑی۔ ہماری حالت دیکھ کر اس کی ہنسی نکلتے ہی لگی تھی۔ مگر پھر وہ چپ ہو گئی۔ کیوں کہ ہماری حالت بہت نازک تھی۔ اس کے بعد ہمیں ہوش نہ رہا۔ جب ہمیں ہوش آیا تو ہم ہسپتال میں پڑے تھے۔ بھڑوں کی وجہ سے ہم اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ ہماری آنکھیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہمیں بے اختیار رونا آگیا۔ امی ابو بھی ہمارے پاس ہی بیٹھے تھے۔ امی ایک طرف خوش ہوئیں کہ ہمیں ہوش آگیا ہے۔ دوسری طرف ہماری حالت دیکھ کر رو پڑیں۔ ہمارے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ہم نے امی اور ابو سے معافی مانگی اور آئندہ شرارت سے توبہ کر لی۔ اب بھی جب ہمیں وہ منظر یاد آتا ہے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

دھرتی ماں

شازیہ پروین خوشبو، گوجرانوالہ

کرسی پر ایک لمبا تڑنگا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آنکھوں کو تاریک چشمے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ ایس ایس خان تھا۔ ملک کے سب سے بڑے تخریب کار گروپ کا باس۔ اس نے گھنٹی بجائی اور نوکر مسٹر جوجو کو بلانے کا کہا۔

"یس باس! آپ نے مجھے بلایا ہے؟" جوجو نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

"دیکھو جوجو 6 ستمبر کو یہاں مقامی اسٹیڈیم میں ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے۔ جس میں ملک کی معروف ترین شخصیتیں بھی شریک ہوں گی۔ تم نے یہ بم وہاں نصب کرنا ہے اور بس۔ باقی کام یہ بم خود کرے گا" باس نے تفصیل سے بتایا۔

"جو حکم باس" جوجو کمرے سے نکلتا ہوا بولا۔

6 ستمبر کو سارا اسٹیڈیم جھنڈیوں اور روشنیوں سے سجا ہوا تھا۔ سارا اسٹیڈیم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا بھی تھا۔ بچے ملی نغمے گا رہے تھے اور وطن کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے اور سب سے اگلی قطار میں بیٹھا جوجو خوابوں کی دنیا میں پہنچا ہوا تھا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد یہ جگہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔ پھر باس مجھے انعام سے نوازے گا اور میں امیر آدمی بن جاؤں گا اور اپنی ماں کا کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کراؤں گا۔ وہ نجانے کب تک خیالوں کی دنیا میں کھویا رہتا کہ ایک آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسٹیج پر ایک پیارا سا بچہ تقریر کر رہا تھا۔

"صاحب صدر! آزادی ایک نعمت ہے۔ ہمیں اس نعمت کا احساس نہیں۔ آزادی کا مفہوم کشمیر و فلسطین اور بوسنیا کے عوام سے پوچھیں جہاں بیٹوں کو ماؤں کے سامنے شہید کیا جاتا ہے۔ جہاں بوڑھوں اور بچوں کو نیزوں پر اچھالا جا رہا ہے۔ ان کے گھروں کو نظر آتش کیا جا رہا ہے اور وہ آزادی حاصل کرنے کے لیے جانوں کی بازی لگا رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم میں سے کچھ لوگ دشمنوں کا آلہ کار بن کر اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ یہاں تخریب کاری اور دہشت گردی پھیلا رہے ہیں۔ دوستو! یہ دھرتی ہماری ماں ہے جو ہم نے آگ اور خون کا دریا پار کر کے حاصل کی ہے۔ اب اسے سنوارنا بھی ہمارا کام ہے اور اس تحفظ کرنا ہمیں اولین ذمہ داری ہے"۔

جوجو کے دل و دماغ میں زبردست جنگ جاری تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ جوجو تو ایسے ہی جذبات میں آ رہا ہے۔ بم رکھ دیا ہے اب جا عیش کر۔ تیری ماں کا علاج بھی ہو جائے گا اور تو خوش حال بھی... لیکن ضمیر اسے تازیانے لگا رہا تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے اور یہ دھرتی بھی تیری ماں کی طرح ہے۔ جو کروڑوں انسانوں کو اپنے سینے سے اناج اور پانی دے کر پالتی پوستی ہے۔ یہ کہاں کا دستور ہے کہ ایک ماں کے لیے دوسری ماں کو نقصان پہنچایا جائے۔

پھر چند لمحوں بعد اس کا رخ اسٹیج کی پچھلی طرف تھا جہاں اس نے بم چھپا کر رکھا تھا۔ کیوں کہ اسے تلف بھی تو کرنا تھا (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

فتح

محمد عمیر اکبر، فیصل آباد

پائلٹ آفیسر فیاض اشارے کے منتظر تھے۔ کیوں کہ پاکستان اور بھارت کی فضائی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ پہلے چار طیارے اڑ چکے تھے اور اب یہ پانچواں طیارہ پرواز کرنے والا تھا۔ پھر اچانک اشارہ ہوا اور پائلٹ آفیسر فیاض کا طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا اور دوسرے ہی لمحے فیاض فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ فیاض کا طیارہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اسے طیارے کی رفتار کم کرنی پڑی۔ کیوں کہ سامنے بھارت کے دو طیارے آ رہے تھے۔ پائلٹ آفیسر فیاض بڑے حوصلے والے اور چست انسان تھے۔ وہ گھبرائے نہیں اور ان کا ہاتھ جہاز میں لگے ہوئے بٹنوں کی طرف گیا اور دوسرے ہی لمحے فیاض کے جہاز سے دو شعلے نکلے اور بھارت کے دونوں جہازوں کے پرخچے اڑ گئے۔

فیاض نے اپنا طیارہ آگے بڑھایا اور پھر تیزی سے بڑھاتا چلا گیا۔ انہیں بھارت کا ایک اور طیارہ نظر آیا۔ جس کے آگے پاکستان کا طیارہ جا رہا تھا۔ بھارت کا طیارہ اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر پائلٹ آفیسر فیاض نے ایسا نہ ہونے دیا۔ پائلٹ آفیسر فیاض کے طیارے میں سے ایک اور شعلہ نکلا اور بھارت کے اس طیارے کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ فیاض نے اپنا طیارہ اور آگے بڑھایا۔ انہیں بھارت کا ایک اور طیارہ نظر آیا جو بھارت جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پائلٹ آفیسر فیاض کو پتا تھا کہ اگر یہ بھارت چلا گیا تو پاکستان کے مفاد میں اچھا نہ ہوگا۔ ان کو معلوم تھا کہ اس کا صرف یہ حل ہے کہ وہ اپنا طیارہ بھارت کے طیارے سے ٹکرا دیں۔

یہ سوچ کر انہوں نے اپنا طیارہ آگے بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے ان کا طیارہ بھارت کے طیارے سے ٹکرا گیا۔ پائلٹ آفیسر فیاض نے شہادت پا کر بھارت کے ناپاک ارادے کو ختم کر دیا تھا بلکہ پاکستان کو بھی فتح سے ہم کنار کر دیا۔ (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

نیکی کام آگئی

محمد ارشد، منڈی بہاؤالدین

گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے ایک بجے کا وقت۔ میں اپنی چارپائی پر لیٹا تعلیم و تربیت پڑھ رہا تھا۔ ابھی میں نے ایک کہانی پڑھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں باہر گیا تو میرا ایک دوست باہر کھڑا تھا۔ اس سے بات چیت کر کے میں دوبارہ آکر چارپائی پر لیٹ گیا اور رسالہ پڑھنے لگا۔ اچانک میری نظر چھت پر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھت پر لگا ہوا پنکھا ہچکولے کھا رہا ہے۔ میں نے چند لمحے اسے دیکھا اور پھر اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد میرا چھوٹا بھائی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بھائی مجھے آئس کریم لے دیں۔ میں نے اتنی سخت گرمی میں باہر جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن پھر اس کے بار بار کے اصرار پر اس کے ساتھ اسٹور پر چلا ہی گیا۔

جب میں واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے کمرے میں سب گھر والے جمع ہیں۔ جب میں نے کمرے میں داخل ہو کر چارپائی کو دیکھا تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہی پنکھا جس کے نیچے میں لیٹا ہوا تھا چارپائی پر گرا پڑا تھا۔ اگر خدانخواستہ میں پنکھے کے نیچے لیٹا ہوتا تو وہ پنکھا میرے سر پر گرتا۔ لیکن کوئی نیکی میرے کام آگئی تھی (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

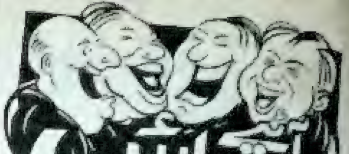

ایک پریشان حال پروفیسر شناختی کارڈ کے دفتر میں کارڈ بنوا رہے تھے کہ ان سے شناختی علامت پوچھی گئی۔ انہوں نے جواب دیا "لکھ دیں پیشانی پر پریشانی کے آثار ہیں"

(حفصہ طارق ساہی وال)

مریض (ڈاکٹر سے): ڈاکٹر صاحب میں جب بھی چائے پیتا ہوں تو میری آنکھ میں درد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر: چائے پینے سے پہلے کپ میں سے چمچ نکال لیا کریں۔

(عمیر احمد خان راول پنڈی)

ایک کنجوس وکیل اپنے بیٹے سے: "میری خواہش ہے کہ تم بھی میری طرح وکیل بنو"

بیٹا: مگر وہ کیوں؟

وکیل: تاکہ میرا کالا کوٹ تمہارے کام آجائے۔

(عمیر احمد خان راول پنڈی)

ڈاکٹر (مریض سے): تمہارا گلا بہت خراب ہے۔ میں نسخہ لکھ دیتا ہوں، دس روپے فیس ہو گی۔

مریض: حضور! کچھ کم فیس لیں مجھے تو غرارے کرنے کے صرف ۵ روپے لئے تھے۔

(محمد آصف شاہد اسلام آباد)

ایک بچہ (عامل سے): مجھے اپنے دادا کی روح سے بات کرنی ہے۔

عامل: (بچے کو ایک اندھیرے کمرے میں لے جا کر) بولو بیٹا (پھر خوفناک آواز پیدا کر کے) یہ تمہارے دادا کی روح بول رہی ہے پوچھو جو پوچھنا ہے۔

بچہ: دادا جان! مجھے آپ سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے۔ آپ کا تو ابھی انتقال بھی نہیں ہوا" (سعدیہ اعجاز اسلام آباد)

ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل ہوا تو سب نے ٹکٹ جیبوں سے نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ ایک غیر حاضر دماغ پروفیسر بھی سفر کر رہے تھے۔ چیکر نے ٹکٹ مانگا تو انہوں نے ہر جگہ تلاش کیا لیکن نہ ملا۔ اس پر چیکر کہنے لگا "پروفیسر صاحب! میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر ٹکٹ نہیں ملا تو نہ سہی آپ سفر جاری رکھیں"۔

پروفیسر بولے "آپ کا بہت شکریہ جناب! مگر مجھے ٹکٹ نہ ملا تو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟"

(حسن طاہر خان اسلام آباد)

پاگل خانے کے ایک مریض نے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ اپنے آپ کو چوہا سمجھنے لگا ہے۔ وہ ہر وقت بلیوں سے ڈرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے بہت سمجھایا کہ تم چوہے نہیں بلکہ انسان ہو اس لیے بلیوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر کی بات سننے کے بعد مریض نے کہا "میں چوہا نہیں ہوں یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب بلیاں یہ بات نہیں جانتیں۔ وہ مجھے چوہا ہی سمجھتی ہیں"

(رشید الظفر منہاس کوہاٹ چھاؤنی)

نام .... عمر

مشاغل ....

پتا ....

سلیم خاں گمی

زندہ و پائندہ... چونڈہ

ہم دونوں دوسری جنگ عظیم میں اکٹھے تھے میں صوبیدار تھا اور سمندر خان کا رینک نائب صوبیدار کا تھا۔ محاذ تھا عراق کا' بدو تھا ریگستان کا۔ معرکہ تھا ٹینکوں کا۔ دوسری بڑی لڑائی میں عراق اور شام کے علاقوں میں برطانیہ کا جنرل منٹگمری اپنے سپاہیوں کے ہمراہ جرمنی کے جرنیل رومیل کے خلاف لڑ رہا تھا۔ دونوں مشہور جرنیل تھے۔ فتح آخر کار انگریز جرنیل کی ہوئی یعنی منٹگمری کی لیکن ہوا دوسری جنگ عظیم ختم کی امریکا نے۔ اس نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرائے۔ شہر تھے ہیروشیما اور ناگاساکی۔ جاپان کے لاکھوں آدمی مارے گئے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور لڑائی بند ہو گئی۔

میں اور سمندر خان واپس گھروں کو آ گئے۔ وہ پشاور کے قریب اپنے گاؤں متنڑی خیل چلا گیا اور میں اپنے گاؤں بھائی افغاناں آ گیا۔ یہ گاؤں ضلع گورداسپور کی تحصیل شکر گڑھ کا تھا۔ جب ہندوستان میں پاکستان بنا تو شکر گڑھ کی تحصیل پاکستان میں آ گئی اور ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھان کوٹ، بٹالہ اور گورداسپور بھارت کے قبضے میں چلی گئیں۔

میں اور سمندر خان فوج کی ٹینک کور میں تھے۔ میں ٹینک افسر تھا اور سمندر خان گنر تھا یعنی ٹینک میں کھڑے ہو کر گولہ پھینکتا تھا دشمن پر۔ تاہم دونوں کا کام بہت مشکل تھا۔ ریت میں ٹینک چلانا آسان کام نہیں لیکن اس سے بھی مشکل کام تو دلدل میں ٹینک چلانا ہے۔ کیچڑ پانیوں سے الجھ جاتا ہے اس کے باوجود ہم ٹینک والے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں طبروق کے محاذ پر جون 1942ء میں خوب لڑے اور جرمنوں کو شکست دی۔ ستمبر 1965ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ٹینکوں کی جو جنگ سیالکوٹ سیکٹر میں چونڈہ کے محاذ پر لڑی گئی وہ منٹگمری اور رومیل کی ٹینک لڑائی کے بعد سب سے بڑی لڑائی تھی۔

اگست 1963ء میں سمندر خان صوبہ سرحد سے مجھے ملنے کے لئے بھائی افغاناں آیا۔ دو سال پہلے میں اسے ملنے کے لئے صوبہ سرحد گیا تھا۔ میں سمندر خان کے پاس چھ سات دن ٹھہرا تھا۔ ہم روزانہ پشاور آتے قصہ خوانی بازار میں گھومتے قہوہ پیتے' چپوں اور بڑے گوشت کے کرارے کباب کھاتے۔ ایک دن سمندر خان نے مجھ

سے کہا "جلال خان' لگتا ہے پاکستان اور انڈیا میں گڑ بڑ شروع ہونے والا ہے"۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے سمندر خان" میں نے کہا

"ادھر سال پہلے رن کچھ میں دونوں ملکوں میں لڑائی مار کٹائی ہو رہی تھا" اس نے یاد دلایا

"ہاں' دونوں ملکوں میں سندھ اور گجرات کے صوبوں کی سرحد پر لڑائی ہوئی تھی"

"اس رن کچھ کی لڑائی میں کون جیتا کون ہارا تھا؟" اس نے سوال کیا

"ظاہر ہے پاکستان جیتا' بھارت ہارا"۔

"اس کا بدلہ لینا چاہتا ہے وہ لوگ" وہ غصے سے بولا

"انڈیا کے وزیر اعظم کا کہنا ہے میں اپنی پسند کا محاذ چنوں گا" میں نے کہا

"اس کا مطلب ہے کہ رن کچھ والا محاذ اس کی پسند کا نہ تھا اس لئے انڈیا کو اس محاذ پر ہار پڑا"۔

"شاید یہ بات ہو لیکن اصل بات یہ ہے مسلمان موت سے نہیں ڈرتا [illegible] تیغ [illegible] سپاہی"۔

بے شک' مسلمان [illegible] غازی۔ مر جاتا ہے تو شہید"۔

[illegible] پاکستان اور بھارت کی سرحدوں پر [illegible] فوجیں [illegible] ہو گئی تھیں۔ مقبوضہ ریاست جموں و [illegible] آزادی [illegible] کشمیر [illegible] لوگوں کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے [illegible] کشمیر کے [illegible] کو ملیا میٹ کرنے کے پروگرام [illegible] کشمیر کا محاذ دن بدن گرم ہو رہا تھا [illegible] انڈیا [illegible] بوکھلا گئی تھی۔ رن [illegible] اور بھارتی لیڈروں پر زور دیا جا رہا تھا کہ پاکستان [illegible] اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری' جب پاکستان ختم ہو جائے گا تو کشمیر کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

ایک دن میں اور سمندر خان گاؤں سے باہر آموں کے باغ میں چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور دونوں ہی اخبار پڑھ رہے تھے کہ سمندر خان نے سوال کیا۔

"انڈیا کا وزیر اعظم لال بہادر شاستری کیا کہتا ہے ہمارے متعلق؟"

"کہتا ہے پاکستان کشمیر میں گڑ بڑ کر رہا ہے" میں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"پاکستان کے مسلمان کشمیر کے مسلمان بھائیوں پر ظلم ہو اور خاموش بیٹھے رہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے پاکستان کے لوگ غیرت مند ہیں۔ وہ اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کیوں نہ کریں"۔

"لگتا ہے پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑائی ہونے والی ہے" میں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا

"جلال بھائی' اگر لڑائی ہونے والی ہے تو ہو جائے۔ ہم لڑائی سے کیوں ڈریں۔ حق سچ کی لڑائی میں ہم حق سچ کے ساتھ ہیں۔ ظلم کے خلاف ہیں۔ انصاف کا ساتھ دیں گے واللہ"۔

"کشمیر کشمیر کے لوگوں کا ہے ان کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں۔ بھارت تو ڈنڈا استعمال [illegible] ہے۔ بھلا ڈنڈے کو کون مانتا ہے" میں نے کہا

"آپ ٹھیک کہا کرتے ہیں لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ لاتوں کے بھوت لاتوں اور ڈنڈوں سے ہی مانا کرتے ہیں"۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکیا آ گیا۔ اس کے پاس گاؤں بھر کے لوگوں کی ڈاک تھی [illegible] میرا [illegible] تھا۔ میں نے وہ کھول کر [illegible] تھا شکر گڑھ [illegible] آ کر [illegible] سے ملو۔ دوسرے دن ہم دونوں [illegible] شکر گڑھ گئے اور بڑے تحصیل دار سے ملے۔ [illegible] یہ وہ لوگ تھے جو سرحدی [illegible] کے رہنے والے [illegible] شکر گڑھ جو اس وقت ضلع سیالکوٹ کی تحصیل تھی اور اب نارووال کی تحصیل ہے شمال جنوب اور مشرق [illegible] بھارت اور مقبوضہ ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ جموں سے گھری ہوئی ہے۔ شکر گڑھ کے ساتھ تحصیل سرور ہے جہاں چونڈہ نام کا گاؤں ہے صوبہ جموں کا ضلع کٹھوعہ تحصیل شکر گڑھ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ جلالہ سے چونڈہ تک کی سرحد بے حد اہم ہے۔ پاکستانی دیہات تو میدانی علاقے میں ہیں اور وہاں کھیتی باڑی

ہوتی ہے جیسے صوبہ جموں کے دیہات پہاڑیوں اور جھاڑیوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ وہاں اونچی نیچی جنگلی گھاٹیاں بھی ہیں پہاڑی جھاڑیاں اور پہاڑی کیکر عام ہیں۔ پہاڑی کیکر چھوٹے قد کے کانٹے دار درخت ہوتے ہیں اور ان میں چیتے، ریچھ اور کئی دوسرے درندے چھپ جاتے ہیں۔

شکر گڑھ کے بڑے تحصیل دار نے سرحدی دیہات کے معتبر اور معزز لوگوں سے کہا کہ وہ پاک بھارت سیاسی حالات سے آگاہ رہیں سرحدی دیہات میں شکری پہرے کا انتظام کریں اور کوئی ایسی ویسی بات ان کے نوٹس میں آئے تو بڑے تحصیل دار کو بتائیں یا تھانے جا کر اطلاع دیں یا فوجی حکام کے نوٹس میں لائیں۔ ہم دونوں شام کو واپس گاؤں آ گئے۔ ہم دونوں فوجی تھے اس لیے دونوں تحصیل دار کی باتوں پر فوجی انداز میں غور کرنے لگے۔

میں نے سوچا جموں کی سرحد پر شکر گڑھ کا آخری گاؤں جلالہ ہے جس کے مشرق میں بھارت کا ضلع گورداس پور ہے اور شمال میں جموں کا ضلع کٹھوعہ ہے۔ دشمن مشرق سے حملہ کرے تو وہ گورداس پور اور پٹھان کوٹ سے آئے گا اور اگر شمال سے حملہ آور ہو تو سانبہ اور کٹھوعہ کی طرف سے پیش قدمی کرے گا۔ جموں بارڈر کے ساتھ ساتھ چلیں تو آگے شکر گڑھ آ جاتا ہے جو پاکستان کا ایک خوبصورت قصبہ ہے اور جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیمی ادارے ہیں۔ اس کے ساتھ مغرب کی طرف چک امرو کا ریلوے سٹیشن ہے جو نارووال شکر گڑھ لائن پر آخری سٹیشن ہے۔ اگر دشمن کٹھوعہ سے حملہ کرے اور چک امرو پر قبضہ کر لے تو چک امرو ریلوے سٹیشن کو اپنا یا فوجی مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اس سے آگے درمان ہے اور درمان سے آگے ظفروال جو تحصیل نارووال میں واقع ہے۔ ظفروال سے آگے چونڈہ اور پسرور ہیں جو تحصیل پسرور میں ہیں اور یہاں سے آگے سیالکوٹ شہر

سرحدی دیہات کے نام سن کر سمندر خاں بولا

"جلال بھائی یہ کتنا فاصلہ ہے؟"

"کون سا فاصلہ سمندر خاں؟" میں نے وضاحت طلب کی

"یہی جو جلالہ سے شروع ہوتا ہے شکر گڑھ اور چک امرو سے ہوتا ہوا درمان اور ظفروال جاتا ہے اور پھر وہاں سے چونڈہ پسرور تک۔"

"ہمارے گاؤں بھائی افغاناں سے چونڈہ ہو گا کوئی دس پندرہ میل اور جلالہ شریف سے پسرور ہو گا کوئی بیس پچیس میل زیادہ نہیں"

"یہ تو کوئی سفر نہ ہوا" وہ بولا

"جیپ پر یا ٹینک پر تو زیادہ سفر نہیں لیکن پیدل تو کافی سفر ہے۔ جلالہ سے چونڈہ تک"

"ہم کون سا روزانہ سفر کریں گے ایک بار ہی سفر ہو گا" سمندر خاں بولا

"نہیں سمجھا۔ کس چیز کے لیے سفر؟" میں نے پوچھا

"بارڈر کے ساتھ ساتھ جتنے دیہات ہیں ہر ایک میں جما کمیٹی بن جائے" سمندر خاں بولا

"وہ کیا کرے گی"

"وہی جو بڑے تحصیل دار نے کہا۔ انڈیا کی طرف سے کوئی شرارتی اطلاع ملے تو تحصیل دار تھانیدار یا فوجی افسر کو بتایا جائے"

"یہ تو ٹھیک ہی ہے"۔

"تو پھر کل سے یہ کام شروع کر دیا جائے۔ جلالہ سے چونڈہ تک ہر گاؤں میں دو تین آدمی ایسے مل جائیں گے جو جہاد کمیٹی بنا کر اپنے اوپر یہ ذمہ داری لیں لے گے اور اگر انڈیا کی طرف سے حملہ کا خطرہ ہوا تو وہ سرکار کو اطلاع کریں گے۔"

اگلے چھ سات دنوں میں ہم دونوں نے جلالہ سے چونڈہ تک جموں کی سرحد کے ساتھ ساتھ جتنے پاکستانی دیہات تھے وہاں جہاد کمیٹیاں قائم کر دیں اور ان کمیٹیوں کے ارکان سے کہا کہ وہ خود مختار ہیں۔ دشمن کے حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے دن رات اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی جائے اور افواج پاکستان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے۔

"چند دنوں بعد جلالہ کے لوگوں نے نالہ ابجہ پر مچھلی کا شکار کرنے والے ایک سکھ کو پکڑا اور پولیس کے حوالے کیا معلوم ہوا وہ یہ پتہ کرنے آیا تھا کہ جلالہ، تمّا، ڈھوڈا، نزکل، جھنیال، دھلا، بھاٹ، بڑاچ، میرپور، ریحیال اور ہنیہ کا علاقہ دلدلی تو نہیں۔ کیا ٹینک دلدل میں پھنس کر تو نہیں رہ جائیں گے۔"

سکھو چک کے مسلمان راجپوت نمبردار محمد خاں نے ایک ڈوگرہ کسان کو پکڑا جو ہائی اسکول کے ایک طالب علم سے ندی نالوں کے متعلق انفارمیشن حاصل کر رہا تھا۔ ظفروال میں ایک سانسی شکاری کتے کے ساتھ پکڑا گیا۔ سانسی جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں جن کا گزارہ صرف شکار پر ہوتا ہے۔ ظفروال میں پکڑا جانے والا سانسی انڈین آرمی کا جاسوس تھا اور یہ دیکھنے آیا تھا کہ پاک آرمی کہاں کہاں مورچہ بند ہے۔ اسے تھانہ ظفروال کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ چونڈہ کے چودھری نصر اللہ خاں نے ایک عورت کو پکڑا جو بکروال قبیلے سے تعلق رکھتی تھی اور سوئیاں بیچنے کے بہانے جاسوسی کرنے کے لیے چونڈہ آئی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ کٹھوعہ اور سانبہ میں ٹینک قطار در قطار کھڑے ہیں اور وہ لڑنے بھڑنے کے لیے آنے ہوتے ہیں۔ ان ٹینکوں کو "پہاڑوں کے جن" کہا جاتا ہے اور یہ جن پاکستان کی سرحد کی طرف بڑی احتیاط سے آ رہے ہیں۔ اس عورت کو بھی تھانہ ظفروال کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔

ہم ظفروال گئے اور وہاں جا کر تھانیدار سے ملے۔ ہم نے جاسوسوں کو حوالات میں ان کے حال پر چھوڑا اور چونڈہ اور پسرور سے ہوتے ہوئے سیال کوٹ لوٹ گئے۔ ایک دو سابق فوجی دوستوں سے ملے۔ معلوم ہوا کہ پاکستان اور انڈیا کی لڑائی ہونے والی ہے کسی دن بھی بھارت پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے۔ بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے بیانات ایک طرح کا اعلان جنگ ہیں۔

سیال کوٹ چھاؤنی کے ڈاک خانہ سے سمندر خاں نے اپنے گھر خط لکھا کہ وہ راضی خوشی ہے گھر والے فکر نہ کریں۔ وہ گھومتا پھرتا ہے۔ گھڑ سواری کرتا ہے۔ اور شکار کھیلتا ہے۔ جب وہ دونوں دو دن کے بعد نارووال اور سیالکوٹ کا چکر لگا کر واپس بھائی افغاناں پہنچے تو اس دن ڈاکیا گاؤں سے ہو کر چلا گیا تھا اور سمندر خاں کے بیٹے قادر خاں کا خط جلال کی معرفت آیا تھا۔ اس میں قادر خاں نے اپنے والد کو تاکید کی تھی کہ وہ صحت کا خیال رکھے یہ بھی لکھا تھا کہ چوں کہ وہ سابق فوجی ہے اس لیے فوج نے اسے طلب کیا ہے۔

سمندر خاں اسی روز بس اور ٹرین کے ذریعے پشاور روانہ ہو گیا اور چوتھے دن واپس آ کر مجھے بتایا کہ جب اس نے پشاور سنٹر کو لکھ کر دیا کہ وہ سیال کوٹ یا لاہور کے محاذ پر خدمت کے لیے تیار ہے تو اسے سیال کوٹ سنٹر بھیجا گیا اور اس کی ڈیوٹی اب شکر گڑھ سیکٹر میں ہے اور اس نے بلوانے کی صورت میں میرا پتہ دیا ہے اس دوران میں مجھے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو مجھے محاذ جنگ پر خدمات کے لیے بلوا لیا جائے گا۔

"میری عمر چالیس سال سے اوپر ہے لیکن لگتا ہے بیس سال کا ہوں" ایک دن سمندر خاں نے کہا۔

"یہی حال میرا ہے میری عمر چار سال اوپر چالیس سال ہے مگر جوانوں کی طرح محسوس کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"اب تو جلال بھائی لڑنے کا مزہ کچھ اور ہو گا۔ پہلے ہم انگریز لوگوں کی خاطر لڑتے مرتے تھا لیکن اب تو اپنے پیارے وطن کے لیے لڑے مرے گا" سمندر خاں نے جوش سے کہا۔

"پاکستان تو ہمیں اپنی زندگی سے پیارا ہے" "ہم تو اپنی زندگی اس کی زندگی پر قربان کر دیں گے" میں پورے جذبے اور ذوق سے بولا۔

"اللہ نے چاہا تو یہاں جو کوئی بھی حملہ کرنے والا آ گیا

ہونے کا مسئلہ رضاؤں نے انھیں بھیج رکھا۔

اس رات ہم نے گاؤں کے لیے [illegible] اور چونڈہ کو ساتھ لیا اور ہماری راہ میں کشتیاں بھرو دیتے رہے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر قریب کے سرحدی دیہات میں گئے اور وہاں کی جماعتوں کے [illegible] سے ملے اور ہمارے دادوں کو شاباش دی۔ جالندھر سے لے کر چونڈہ تک سرحدی دیہات کے لوگ ہم دونوں سابق فوجیوں کے ناموں سے خوب واقف تھے۔ جماعتوں کے اراکین تو ہم کو خوب اچھی طرح جانتے تھے اور ہمارے جوش اور ولولے سے بھی آگاہ تھے۔

اگست میں صوبہ جموں کے بکروالوں کا ایک کنبہ سرحد پار کر کے پاکستان میں آیا تو پتہ چلا کہ سرحد کے ساتھ ساتھ جتنے دیہات تھے ان کو خالی کروا لیا گیا ہے اور جموں کے مسلمان بکروالوں اور چرواہوں سے بیگار لی جاتی ہے اور ان کو شک و شبہ سے دیکھا جاتا ہے کہ کہیں پاکستان کے جاسوس نہ ہوں۔ ٹرین کے ذریعے دہلی سے انڈین آرمی پٹھان کوٹ کے راستے سے جموں توی ریلوے سٹیشن پر آ رہی ہے اور دوسرا جنگی ساز و سامان بھی برابر چلا آ رہا ہے۔ بھارت تہیہ کر چکا تھا کہ پنجاب کو میدان جنگ بنائے گا۔ اس غرض کے لیے وہ سب سے پہلے لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے امرتسر سے حملہ ہو سکتا تھا یا جموں کی سمت سے سیالکوٹ پر حملہ ہو سکتا تھا اور پھر سیالکوٹ سے گوجرانوالہ اور گوجرانوالہ سے لاہور گویا ایک دم دو حملے ہو سکتے تھے ایک واہگہ بارڈر سے اور دوسرا جموں سیالکوٹ بارڈر سے اور آخر کار ایسا ہی ہوا۔

بھارتی فوجیں کشمیر میں جنگ بندی لائن توڑ کر آزاد کشمیر میں آ جاتے تھے ان کو روکنے کے لیے میجر جنرل اختر ملک نے چند مجاہد دستے مقبوضہ کشمیر بھیجے۔ [illegible] بھارتی فوجوں کو [illegible] جنگ بندی لائن توڑنے کی [illegible] انڈین آرمی نے [illegible] آزاد کشمیر کے دوسرے علاقوں میں [illegible] ان کو حق [illegible] کرنے کے لیے چھمب جوڑیاں پر حملہ کیا گیا اور پاکستان نے [illegible] کر دیا۔ اس سے [illegible] چھمب [illegible] جوڑیاں [illegible]

[illegible]

نے چھمب جوڑیاں کے محاذ پر پاکستان نے یکم ستمبر 1965ء کو حملہ کیا تھا مقصد یہ تھا کہ پٹھان کوٹ اور جموں کے درمیان اکھنور شہر پر قبضہ کیا جائے تاکہ پٹھان کوٹ اور جموں کا بھارتی راستہ روکا جائے لیکن اسی دوران بھارت نے پسرور گوجرانوالہ روڈ پر قبضہ کرنے کے لیے چونڈہ پر حملہ کر دیا اور لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے واہگہ اور بیدیاں کی طرف سے انٹرنیشنل بارڈر پار کر کے اچانک رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا۔

چونڈہ پر قبضہ کرنے کے لیے انڈین آرمی پورے 16 دن کوشش کرتی رہی لیکن بری طرح ناکام رہی۔ چونڈہ پر قبضہ کرنے کے لیے انڈین آرمی کے ٹینک ڈویژن 'پیدل فوج کے ڈویژن یعنی انفنٹری ڈویژن' پہاڑی ڈویژن یعنی وہ فوجی جن کو پہاڑوں میں لڑنے کے لیے خاص تربیت دی گئی تھی اور جس کو ماؤنٹین ڈویژن بھی کہتے ہیں شامل تھے۔ 64 عدد توپ خانے تھے جن میں چھوٹی درمیانی اور بڑی توپیں تھیں۔

اصل حملہ ٹینکوں کا تھا۔ ٹینک ڈویژن سب سے آگے تھی۔

اس کے دائیں بائیں تین انفنٹری ڈویژن تھے ان کے پیچھے 64 توپ خانوں کے گولوں کی بارش تھی جس کے سائے میں یہ آگے بڑھے۔ گولوں کی بارش پاکستانی مجاہدوں پر برسائی گئی تاکہ وہ ڈر جائیں۔ پاکستان کے پاس بہت تھوڑے ٹینک تھے۔ انڈین آرمی کے پانچ فوجیوں کے مقابلہ میں پاکستان آرمی کا ایک جوان تھا۔ انڈین ٹینکوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ تھا۔ اگر زیادہ نہ بھی ہو پھر بھی پانچ ٹینکوں کا مقابلہ ایک ٹینک سے کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ چناں چہ چونڈہ کی لڑائی میں پاکستانی ٹینکوں اور فوجیوں نے موت کی اس دعوت کو مقبول کیا اور سرخرو ہو کر اس آزمائش سے نکلے۔

انڈین حملہ سانبہ اور رام گڑھ کی طرف سے کیا گیا۔ سب سے پہلے وہ پاکستان کے گاؤں چارروہ پہنچے۔ چارروہ پہنچنے سے پہلے وہ درختوں کے نیچے کھائیوں کے اندر اور اونچی گھاس کی اوٹ میں چھپے رہے۔ یہ میدانی علاقہ ہے ہر قسم کی فصل ہوتی ہے ان دنوں کماد کی فصل تھی جو فوجیوں توپوں اور ٹینکوں کو چھپنے کے لیے بہترین موقع فراہم کرتی تھی۔ ٹینکوں کی لڑائی کے لیے یہ بہت ہی عمدہ علاقہ تھا۔ کیوں کہ یہاں نہ ندی نالے تھے۔ نہ کیچڑ تھا اور نہ ہی کوئی کھائی یا جنگل تھا۔ انڈین آرمی کو پکا یقین تھا کہ ٹینک آگے بڑھتے رہیں گے اور ان کے فوجی گلی کوچوں گاؤں، شہروں، کھیتوں اور کھلیانوں کو تہس نہس کر دیں گے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔

میں اور سمندر خاں چونڈہ میں تھے۔ ہمارا ٹھکانہ چودھری نصر اللہ خان نمبردار کی حویلی تھی۔ سارا گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ چونڈہ ہی نہیں دوسرے کئی دیہات بھی خالی ہو چکے تھے۔ عورتیں اور بچے پیچھے ہٹ کر رشتہ داروں کے پاس جا چکے تھے۔ ان دیہات کے رضا کار پاک فوج کا ساتھ دینے کے لیے حاضر تھے۔ ہم بھی ان میں سے تھے۔ جو کام نظر آتا کر دیتے۔ اس میں زخمیوں کی دیکھ بھال ان کی مرہم پٹی بھی شامل تھی۔ یہ عام دن نہ تھے 'قیامت کے دن تھے۔ بدباطن دشمن آگ کا طوفان بن کر ہمارے پیارے وطن پر چڑھ دوڑا تھا اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا۔

سمندر خاں کو راجا پٹھان تھا لیکن 8 ستمبر سے لے کر 17 ستمبر تک ٹینکوں کی لڑائی میں شرکت سے اس کا رنگ سنولا گیا تھا۔ ہم مورچے میں بیٹھے تھے کہ وہ بولا

"میں نے سنا ہے کہ جو انتظار کرتے ہیں وہ بھی لڑائی میں شریک ہوتے ہیں"۔

"آپ نے درست سنا سمندر خاں" میں نے کہا

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بھی لڑائی میں شریک ہیں" وہ بولا

"بے شک۔ کیوں؟ کیا خیال ہے آپ کا" میں نے سوال کیا

"میں تو چاہتا تھا کہ میرے پاس ٹینک ہوتا اور میں اس کی کمان کرتا" وہ بولا

"پاکستان کا بچہ بچہ اس وقت یہی چاہتا ہے لیکن اتنے ٹینک نہیں ہیں سمندر خان"

"ٹھیک بات ہے۔ اتنے ٹینک نہیں ہیں۔ ادھر چونڈہ میں کتنے ٹینک ہیں"

"بہت تھوڑے ہیں۔ ہمارے ایک ٹینک کے مقابلہ میں ان کے پاس پانچ چھ ٹینک ہیں اور پھر ہر ٹینک کے پیچھے ان کے کئی گنا فوجی ہیں لیکن اصل مقابلہ ٹینکوں کا ہے سمندر خان"

"اگر ٹینک کم ہیں تو پھر کس طرح دشمن کا ٹینک روکا جائے گا؟"

"ٹینک شکن توپ سے"

"وہ بھی تو کم ہیں ہمارے پاس' اب بتاؤ"

"ہم خود ٹینک بن جائیں گے۔ ہم خود انڈین ٹینکوں کو اپنے ہاتھوں تباہ کریں گے؟"

"وہ بھلا کیسے؟"

"دستی بم لے کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ جائیں گے"

اس کے بعد سمندر خان نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

چارروہ کے راستہ چونڈہ پر حملہ 8 ستمبر کو ہوا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ پاک فوج کے جوان فولادی دیوار بن کر حملہ آوروں کے خلاف ڈٹ گئے۔ یہی کچھ 9 اور 10 ستمبر کو ہوا۔ 11 ستمبر کو دشمن نے ایک تنگ محاذ پر ٹینکوں سے یورش کی۔ وہ چارروہ اور پھلورا کی طرف بڑھا اور چونڈہ کا رخ کیا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ 12 ستمبر کو بھاگو وال میں شدید لڑائی ہوئی اور دشمن آگے نہ بڑھ سکا۔ 13 ستمبر کو چونڈہ کے مغرب میں انڈین ٹینکوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا لیکن

ہماری پیدل فوج توپ خانہ اور رائیر فورس کی جرات اور دلیری کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ 14 ستمبر کو سارا محاذ آگ کا سمندر بنا رہا۔ چاروہ' چوبارہ' گڈ گور' بھاگو وال' رکھ بابا بھورے شاہ' پھلورا' الڑ' وزیر والی' کالے والی' بڈیانہ' بٹر ڈوگرانڈی' سبز کوٹ اور ظفر وال کے محاذوں پر دن رات لڑائی لڑی گئی اور دشمن کی آگے بڑھنے کی ہر کوشش ناکام بنادی گئی۔ 15 ستمبر کو بھی لڑائی کی شدت میں کمی نہ ہوئی بلکہ شدت میں تیزی آئی۔

16 ستمبر کو دشمن نے حملوں کا نیا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے وہ بڑے گروپوں کے ساتھ حملہ کرتا تھا۔ 8 ستمبر سے 15 ستمبر تک ناکام رہا۔ 16 ستمبر کو ٹینکوں اور انفنٹری کے کئی چھوٹے چھوٹے گروپ بنائے اور تنگ محاذ کے بجائے کھلے محاذ پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ بھارت' حوصلے' تیز رفتاری اور دلیری سے لڑتے ہوئے پاکستان کے بہادروں نے اس کوشش کو بھی ناکام بنادیا۔

17 ستمبر کو بٹر ڈوگرانڈی پر حملہ کرکے دشمن کو تہس نہس کیا گیا۔ انڈیا کی طرف سے ٹینکوں کے حملہ کا یہ آخری دن تھا۔ اس کے بعد سولہ ستمبر تک حملے تو ہوئے لیکن ان میں نہ شدت تھی اور نہ زور تھا۔ 17 ستمبر کو دن کو بھی اور رات کے وقت بھی انتہائی شدید لڑائی ہوئی۔ بھارت نے آگے بڑھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ محاذ جنگ کی مٹی سرمہ بن گئی۔ گردو غبار چاروں طرف چھایا رہا۔ ہر طرف سے آگ برستی رہی۔ ہمارے بہادروں کے نعرے گونجتے رہے۔ ٹینکوں کی کمی کی وجہ سے پاک فوج کے جیالے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دستی بم لے کر آگے بڑھتے رہے اور انڈین ٹینکوں کے نیچے لیٹ کر ان کو تباہ کرتے رہے

18 ستمبر کی صبح طلوع ہوئی تو میں مورچے میں اکیلا تھا۔ سمندر خان چپکے سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں اسی کو تلاش کرنے لگا۔ اسے تلاش کرتے ہوئے میں اس طرف نکل گیا جہاں ٹینک کباڑ خانے کا مال بن چکے تھے۔ ٹینکوں' توپوں اور جہازوں کی گولہ باری سے ہر طرف ٹوٹا پھوٹا اسلحہ بکھرا پڑا تھا۔ انسانی جسموں کے حصے اور لوتھڑے بھیانک سماں پیدا کر رہے تھے۔ پاک فوج کی میڈیکل کور کے جوان اور دوسرے شعبوں کے افسر زخمیوں کو اٹھا رہے تھے اور شہدا کے کفن دفن میں مصروف تھے۔ میں صبح سے بارہ بجے تک سمندر خان کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن وہ نہ ملا۔ آخر میں نے طے کیا کہ پسرور جا کر متعلقہ شعبہ کو بتاؤں کہ سمندر خان لاپتا ہے۔ میں مڑنے والا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے پیچھے سے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ میں پلٹ کر دیکھنے لگا۔ سامنے خاک میں اٹا سمندر خان کمر کے بل پڑا تھا اور ساتھ ہی انڈین ٹینک جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ میں نے جھک کر سمندر خان کا ماتھا چوما اور پھر اسے خاک سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس نے موت قبول کی تھی تاکہ اس کا پیارا وطن زندہ رہے۔ میں نے اس کے ارد گرد دشمن کے جلے بجھے ٹینک دیکھے اور پھر اسے دیکھا وہ اپنی کمر سے بم باندھ کر بھارت کی کمر کو توڑ چکا تھا۔

بلا عنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتابیں لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 ستمبر 1998ء

اگست 1998ء کے بلا عنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کیے ان میں سے یہ چھ ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- عشرت جاوید بہاول پور (ایسا تو سوچا بھی نہ تھا) پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- شہزادہ ہمایوں ملک 'میانی اڈا' (تم تو انعام ابھی لو) دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
- شعیب احمد 'لیاقت پور' (ارے تم کہاں سے آ ٹپکے) تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- شازیہ کنول 'میرپور خاص' (آخر میرا قصور کیا تھا؟) چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- تنظیم کوثر کوہاٹ (حسن اتفاق) پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
- محسن افتخار 'لاہور' (دونوں تھوا) چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO CPL 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

اپنے شہر کے کتب فروش سے طلب کیجیے

5 سال سے 8 سال تک کے بچّوں کے لیے

نہایت دل چسپ اور مزیدار کہانیاں

آسان زبان ☀ جلی کتابت

ہر کہانی رنگین اور خوب صورت تصویروں سے سجی ہوئی!

سنڈریلا

ہنسل اور گریٹل

بی مانو کہاں چلیں؟

چندا رانی

لال ٹوپی والی

ایک بھیڑیا سات میمنے

رپل ڈپل

چار دوست

واہ رے عقل مند

سفید گلاب، سرخ گلاب

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی